جستجو

طاہر جاوید مغل

نیکی اور بدی کے درمیان ازلی چپقلش کا احوال

جُستجُو

طاہر جاوید مغل

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ ، اُردو بازار ، لاہور ۔فون ۷۲۴۷۴۱۴

سورج ڈھل گیا تھا اور دھوپ کی تمازت میں کافی کمی آ گئی تھی۔ کیپٹن مراد ایک انگڑائی لے کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی' دو بجنے والے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹا تھا شاید آنکھ لگ گئی تھی' ایک گھنٹہ ایک پل کی طرح گزر گیا تھا۔ وہ اٹھ کر چھولداری سے باہر آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک فرحت بخش جھونکا جسم سے ٹکرایا اور روح تر و تازہ ہو گئی' اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک اور انگڑائی لی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اس کا پیٹ کچھ اور اندر کی طرف چلا گیا اور کشادہ سینہ کچھ اور باہر کی طرف نکل آیا' اس نے اپنی خاکی قمیض کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور کہنیوں سے اوپر اس کی سرخ و سپید سڈول بانہیں نظر آ رہی تھیں' ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں ..... کتنی خوبصورت اور بھرپور انگڑائی تھی وہ' پاؤں اور ہاتھوں سے لے کر ہاتھوں کی بھنچی ہوئی مٹھیوں تک کم از کم آٹھ فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سیاہ آنکھوں والا کوئی دراز قد چیتا انگڑائی لے رہا ہو۔

اس نے اپنے ہاتھ نیچے گرائے' پھر اردگرد کا جائزہ لیا دور شمال کی طرف ہلکے ہلکے بادل نظر آ رہے تھے' گو ابھی وہ سورج سے کافی دور تھے لیکن دھوپ میں پہلے والا دم خم نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر خاکی نیکروں اور سفید بنیانوں میں ملبوس فوجی جوان خندقیں کھودنے میں مصروف تھے۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے کافی کھدائی کر لی تھی' مٹی کے ڈھیر پہلے سے بلند ہو گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر چار پانچ خیمے اور نظر آ رہے تھے۔ نیم کے درخت تلے ایک ٹیپ کھڑی تھی دو آدمی اس کی صفائی میں مصروف تھے۔ قریب ہی سے پانی کی ایک لکیر گزرتی تھی۔ ایک آدمی کھال سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لا رہا تھا۔ دوسرا

جستجو
دوسری منزل

۷
۱۱۳

پہیوں سے مٹی چھڑانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ اس کا ادھیڑ عمر اردلی محمد حسین تھا۔ مراد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی' اس نے بلند آواز سے کہا۔

"محمد حسین! بس کر۔ کچھ پانی کھیتوں کو بھی جانے دے ایک گھنٹہ ہو گیا تجھے پانی چوری کرتے ہوئے۔"

محمد حسین نے سر اٹھا کر کیپٹن مراد کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کو نچوڑتا ہوا بولا۔ "صاحب' ادھر دیکھو بادل آ رہے ہیں۔ جتنا پانی لے رہا ہوں اس سے زیادہ مل جائے گا کھیتوں کو۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں بس کر۔" کیپٹن مراد نے بے تکلفی سے کہا۔ "کیچڑ میں چلنا ہو تو جوتے پالش نہیں کرتے۔"

اردلی محمد حسین اس کی بات کو سمجھا نہیں لیکن کچھ دور کھڑا لیفٹیننٹ ادریس مسکراتا ہوا بولا۔ "کیپٹن صاحب میرا خیال ہے ہم خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بارش وارش کا چکر نہیں تھوڑی سی آندھی آئے گی اور بس۔ کل پھر ہم ہوں گے اور یہی آگ برساتا ہوا سورج۔"

گرمی نے ان لوگوں کو کافی پریشان کر رکھا تھا' مئی کا مہینہ تھا لیکن گرمی کا زور دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دفعہ اگلے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ وہ پچھلے پانچ روز سے اس علاقے میں موجود تھے' فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔ کیپٹن مراد کی کمپنی کو نہر کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ کوئی چار میل لمبے ٹکڑے کی حفاظت کرنا تھا۔ سارا کام پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ آج صبح گیارہ بجے سیکٹر کمانڈر کی طرف سے اچانک پُل کے سامنے خندقیں کھودنے کا حکم ملا تھا' یہ کام انہیں آج شام تک مکمل کرنا تھا۔

کیپٹن مراد آہستہ قدموں سے چلتا ہوا لیفٹیننٹ ادریس کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فوجی گاڑی سے ریت کی بوریاں اتروا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ٹرک پر ڈالی اور پھر خندقوں کی طرف بڑھ گیا۔ کام توقع سے زیادہ تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ آدھ گھنٹے کے اندر کھدائی مکمل ہو جائے گی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس کا ہاتھ خود بخود اپنی

جیب کی طرف چلا گیا اسے اس خط کے بارے میں یاد آ گیا تھا جو وہ پچھلے چھ روز سے جیب میں لیا پھرتا تھا۔ گھر سے خط آیا تھا' اس کی خالہ نے حسبِ سابق ایک بار پھر شادی پر اصرار کیا تھا۔ جب سے ایک لڑکی خالہ کی نظروں میں آئی تھی اس کے خطوں کی تعداد اور طوالت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس دفعہ تو اس نے لڑکی کی تصویر بھی ساتھ بھیجی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر مراد خود نہیں آ سکتا تو بذریعہ خط ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر دے۔ خط پڑھنے کے بعد مراد کافی دیر وہ تصویر دیکھتا رہا تھا' رنگین تصویر میں چہرے کی تمام خوبیاں عیاں ہو رہی تھیں' کوائف بھی نہایت متاثر کن تھے۔ خالہ اسے بیٹوں کی طرح چاہتی تھی' ظاہر ہے اس کا انتخاب بھی ماں جیسا رہا ہو گا ..... جب کیپٹن مراد کو یاد آیا کہ اسے اس اہم خط کا جواب دینا ہے تو ایک دم ذہن پر بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔ محمد حسین بڑے انہماک سے جیپ کے داغ دھبے دور کرنے میں مصروف تھا۔ مراد اس پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا چھولداری میں داخل ہو گیا ..... اور یہی وہ وقت تھا جب اسے دائیں ٹخنے کے ذرا سا اوپر پنڈلی کے سامنے والے حصے پر درد کی ٹیس محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس گاہے گاہے محسوس ہوتی رہتی تھی۔ مراد اب بہت حد تک اس کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس ٹیس کے ساتھ ماہ و سال کی وابستگی نے اسے ایک بات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ یہ ٹیس بلاوجہ نہیں اٹھتی تھی' مراد نے بارہا آزمایا تھا کہ درد کی یہ لہر کسی اہم واقعے کی پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ اہم سے یہ مراد نہیں کہ وہ واقعہ ناقابلِ فراموش یا نہایت سنگین نوعیت کا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات ہوتی تھی لیکن اس میں چونکا دینے والی کیفیت ضرور ہوتی تھی مثلاً یہی کہ کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی' کسی سے جھگڑا ہو گیا' بیٹھے بٹھائے کام کے سلسلے میں کہیں دور جانا پڑ گیا۔ ابھی تک وہ "درد کے اس رشتے" کو کوئی واضح نام نہیں دے سکا تھا۔ شاید یہ چھٹی حس کی کوئی بدلی ہوئی صورت ہو۔

اس نے ٹانگ کو ایک دو بار ہلکا سا جھٹکا دیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنے دروازے پر دستک سنے لیکن اٹھنا نہ چاہے اور ذہن کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ

پہیوں سے مٹی چھڑانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ اس کا ادھیڑ عمر اردلی محمد حسین تھا۔ مراد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی' اس نے بلند آواز سے کہا۔

"محمد حسین! بس کر۔ کچھ پانی کھیتوں کو بھی جانے دے ایک گھنٹہ ہو گیا تجھے پانی چوری کرتے ہوئے۔"

محمد حسین نے سر اٹھا کر کیپٹن مراد کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کو نچوڑتا ہوا بولا۔ "صاحب' ادھر دیکھو بادل آ رہے ہیں۔ جتنا پانی لے رہا ہوں اس سے زیادہ مل جائے گا کھیتوں کو۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں بس کر۔" کیپٹن مراد نے بے تکلفی سے کہا۔ "کیچڑ میں چلنا ہو تو جوتے پالش نہیں کرتے۔"

اردلی محمد حسین اس کی بات کو سمجھا نہیں لیکن کچھ دور کھڑا لیفٹیننٹ ادریس مسکراتا ہوا بولا۔ "کیپٹن صاحب میرا خیال ہے ہم خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بارش وارش کا چکر نہیں تھوڑی سی آندھی آئے گی اور بس۔ کل پھر ہم ہوں گے اور یہی آگ برساتا ہوا سورج۔"

گرمی نے ان لوگوں کو کافی پریشان کر رکھا تھا' مئی کا مہینہ تھا لیکن گرمی کا زور دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دفعہ اگلے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ وہ پچھلے پانچ روز سے اس علاقے میں موجود تھے' فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔ کیپٹن مراد کی کمپنی کو نہر کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ کوئی چار میل لمبے ٹکڑے کی حفاظت کرنا تھا۔ سارا کام پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ آج صبح گیارہ بجے سیکٹر کمانڈر کی طرف سے اچانک پُل کے سامنے خندقیں کھودنے کا حکم ملا تھا' یہ کام انہیں آج شام تک مکمل کرنا تھا۔

کیپٹن مراد آہستہ قدموں سے چلتا ہوا لیفٹیننٹ ادریس کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فوجی گاڑی سے ریت کی بوریاں اتروا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ٹرک پر ڈالی اور پھر خندقوں کی طرف بڑھ گیا۔ کام توقع سے زیادہ تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ آدھ گھنٹے کے اندر کھدائی مکمل ہو جائے گی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس کا ہاتھ خود بخود اپنی

جیب کی طرف چلا گیا اسے اس خط کے بارے میں یاد آ گیا تھا جو وہ پچھلے چھ روز سے جیب میں لیا پھرتا تھا۔ گھر سے خط آیا تھا' اس کی خالہ نے حسبِ سابق ایک بار پھر شادی پر اصرار کیا تھا۔ جب سے ایک لڑکی خالہ کی نظروں میں آئی تھی اس کے خطوں کی تعداد اور طوالت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس دفعہ تو اس نے لڑکی کی تصویر بھی ساتھ بھیجی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر مراد خود نہیں آ سکتا تو بذریعہ خط ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر دے۔ خط پڑھنے کے بعد مراد کافی دیر وہ تصویر دیکھتا رہا تھا' رنگین تصویر میں چہرے کی تمام خوبیاں عیاں ہو رہی تھیں' کوائف بھی نہایت متاثر کن تھے۔ خالہ اسے بیٹوں کی طرح چاہتی تھی' ظاہر ہے اس کا انتخاب بھی ماں جیسا رہا ہو گا ..... جب کیپٹن مراد کو یاد آیا کہ اسے اس اہم خط کا جواب دینا ہے تو ایک دم ذہن پر بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔ محمد حسین بڑے انہماک سے جیپ کے داغ دھبے دور کرنے میں مصروف تھا۔ مراد اس پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا چھولداری میں داخل ہو گیا ..... اور یہی وہ وقت تھا جب اسے دائیں ٹخنے کے ذرا سا اوپر پنڈلی کے سامنے والے حصے پر درد کی ٹیس محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس گاہے گاہے محسوس ہوتی رہتی تھی۔ مراد اب بہت حد تک اس کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس ٹیس کے ساتھ ماہ و سال کی وابستگی نے اسے ایک بات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ یہ ٹیس بلاوجہ نہیں اٹھتی تھی' مراد نے بارہا آزمایا تھا کہ درد کی یہ لہر کسی اہم واقعے کی پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ اہم سے یہ مراد نہیں کہ وہ واقعہ ناقابلِ فراموش یا نہایت سنگین نوعیت کا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات ہوتی تھی لیکن اس میں چونکا دینے والی کیفیت ضرور ہوتی تھی مثلاً یہی کہ کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی' کسی سے جھگڑا ہو گیا' بیٹھے بٹھائے کام کے سلسلے میں کہیں دور جانا پڑ گیا۔ ابھی تک وہ "درد کے اس رشتے" کو کوئی واضح نام نہیں دے سکا تھا۔ شاید یہ چھٹی حس کی کوئی بدلی ہوئی صورت ہو۔

اس نے ٹانگ کو ایک دو بار ہلکا سا جھٹکا دیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنے دروازے پر دستک سنے لیکن اٹھنا نہ چاہے اور ذہن کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ

دروازہ ہوا سے ہلا ہو گا۔ وہ چھولداری کے اندر اپنی چھوٹی سی میز کے سامنے آ بیٹھا۔ پھر اس نے قمیض کی اوپری جیب سے تہہ کیا ہوا لفافہ نکالا۔ ایک بار پھر سارا خط شروع سے آخر تک پڑھا' پھر لیٹر پیڈ اپنی طرف کھسکا کر قلم ہاتھ میں لیا اور کچھ سوچنے لگا' اس وقت اچانک چھولداری کا پردہ ہلا اور لیفٹیننٹ ادریس اندر داخل ہوا۔

"سر! خندق کے اندر سے ایک ڈھانچہ برآمد ہوا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"انسانی ڈھانچہ!" مراد نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں! آئیں دیکھیں۔"

مراد نے قلم بند کر کے جیب میں لگایا اور ادریس کے پیچھے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ کھدائی کرنے والے تمام جوان ایک خندق کے گرد جمع تھے' مراد آہستہ قدموں سے چلتا ہوا خندق کے اوپر پہنچا۔ اس نے اندر جھانکا' دو جوان کھدائی کر رہے تھے ایک لمبی سی ہڈی مٹی کے اوپر نظر آ رہی تھی اور تب مراد کی نظر اپنے قدموں پر پڑی۔ اس کے قدموں میں ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا' کھوپڑی کے ساتھ ہاتھ پاؤں کی لمبی لمبی ہڈیاں بھی پڑی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کھدائی کرنے والوں نے چند اور ہڈیاں نکال کر کنارے پر ڈھیر کر دیں۔ مراد نے غور سے کھوپڑی کو دیکھا۔ وہ کچھ چھوٹی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی بچے کی ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے کی ہو۔ وہ کوئی ماہر تو تھا نہیں کہ کھوپڑی کا حجم دیکھ کر اس کا اندازہ لگا لیتا۔ وہ کھوپڑی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ دوسرے لوگ کتنے اطمینان سے ان ہڈیوں کو دیکھ رہے ہیں' ان کے لئے یہ ہڈیاں صرف ہڈیاں ہیں ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ ہڈیاں لیکن یہ ڈھانچہ بھی کبھی گوشت پوست کا انسان رہا ہو گا' اس کا بھی کوئی نام رہا ہو گا' یہ کسی کا بھائی کسی کا بیٹا ہو گا' اگر اس گمنام شخص کا کوئی قریبی عزیز ان ہڈیوں کو دیکھے تو اس کے کیا احساسات ہوں گے۔ کھدائی کرنے والے بھی اب باہر آ گئے تھے اور اپنی دریافت کردہ ہڈیوں کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی اور ہڈی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ لیفٹیننٹ ادریس کا خیال تھا کہ ہڈیوں کو یہیں دفن کر دیا جائے اور خندق چار فٹ ہٹ کر بنالی جائے۔

لیکن مراد کی رائے مختلف تھی' ہڈیوں کو دیکھ کر اس کے دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ وہ کوئی کمزور آدمی نہیں تھا لیکن حساس ضرور تھا اور حساس ہونا کوئی بری بات نہیں۔ جہاں تک اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا تعلق تھا' اس کی بے خوفی اور شجاعت کو اس کے افسر اور ماتحت سب مانتے تھے' وہ بیرک کا نہیں' میدانِ جنگ کا آدمی تھا' وہ ان سپاہیوں میں سے تھا جو گھمسان کے رن میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ 1971ء میں وہ "این سی سی" کر رہا تھا اسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ گنڈا سنگھ والا بارڈر کے پیچھے مورچوں میں تعینات کیا گیا' یہاں اس کے سپاہیانہ جوش و خروش نے سب کو حیران کر دیا۔ وہ سخت ترین ڈیوٹی قبول کرنے کے لئے سب سے پہلے ہاتھ بلند کرتا تھا۔ رات کے یخ بستہ سناٹے میں جب مورچے کی حفاظت کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو وہ ہاتھ میں پکڑے ہینڈ گرینیڈ کی سیفٹی پن کھینچ کر علیحدہ کر دیتا۔ نیند بھاگ جاتی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ دشمن کے طیاروں پر فائرنگ کرتے وقت الٹے مت لیٹیں۔ انہیں اگر گولی لگے تو سینے پر لگے۔ بعد میں جب کمیشنڈ آفیسر بھرتی ہوا تو اس کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ اب وہ ایک مکمل فوجی تھا۔ نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھلا ہوا فولادی پیکر۔

وہ اپنے خیمے میں گیا اور اندر سے سفید رنگ کا میز پوش لے آیا۔ اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ تمام ہڈیاں اس میں باندھ دو۔ ان کے کیمپ سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر جہاں کھیت شروع ہوتے تھے' مٹی کا ایک ٹیلہ تھا۔ ٹیلے کے دامن میں چھوٹا سا ایک قبرستان تھا۔ کیپٹن مراد صبح کے وقت چہل قدمی کرتا ہوا دو تین دفعہ اس طرف گیا تھا۔ اس نے چار جوانوں کو حکم دیا کہ یہ ہڈیاں اس قبرستان میں لے جا کر دفن کر دو۔ خندق کی کھدائی اسی جگہ جاری رکھنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے خیمے میں آ بیٹھا۔ پنڈلی میں ہونے والا میٹھا میٹھا درد اب معدوم ہو چکا تھا۔ نیلا خط اور سفید لیٹر پیڈ اسی طرح میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے جیب سے قلم نکالا اور ایک بار پھر خیالات جمع کرنے لگا لیکن ذہن میں بار بار مٹی سے بھری ہوئی انسانی کھوپڑی گھوم جاتی۔ اس نے سر کو جھٹکا اور تھوڑا

سامیز پر جھک گیا۔ ابھی وہ ابتدائی جملے ہی لکھنے پایا تھا کہ ایک بار پھر باہر سے سپاہیوں کی اونچی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اندازہ لگایا اب کوئی اور چیز برآمد ہو گئی ہے' وہ تیز قدموں سے باہر نکلا۔ تمام عملہ ایک بار پھر اسی خندق کے گرد جمع تھا۔ حوالدار شجاعت' کدال کی نوک سے کچھ کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ جگہ پہلے والی جگہ سے تقریباً دو فٹ آگے تھی۔ کسی سخت سی چیز کا کونہ مٹی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مراد پہچان گیا کہ یہ کوئی صندوق ہے۔ تمام لوگ بے تابی سے مٹی ہٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اب صندوق کی ایک جانب بالکل صاف نظر آ رہی تھی لیکن اسے مٹی سے نکالنے کے لئے ضروری تھا کہ اوپر سے نیچے تک ساری زمین دو فٹ اور کھودی جائے' ایک تازہ دم جوان نے جلدی جلدی کسّی چلانی شروع کی اور تھوڑی دیر بعد صندوق کی چھت نصف سے زائد نظر آنے لگی' جیساکہ مراد کو توقع تھی صندوق کی چھت ٹوٹ چکی تھی اور اس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اسے کھینچ کر مٹی سے نکالا گیا اور کنارے پر رکھ دیا گیا۔ صندوق کی دیواریں چاروں طرف سے زنگ آلود تھیں۔ کہیں کہیں نیلے رنگ کے دھبے نظر آ رہے تھے' جو اس بات کے شاہد تھے کہ کبھی صندوق کا رنگ نیلا رہا ہو گا۔ صندوق کو ایک زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ تالے سے نیچے تقریباً دو انچ مربع کا ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں سے کچھ گرد آلود کپڑے نظر آ رہے تھے' موقع پر موجود تمام افراد کے دل دھڑک رہے تھے۔ پتہ نہیں صندوق سے کیا برآمد ہونے والا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس عام سے گھریلو استعمال کے صندوق میں کوئی خزانہ وزانہ نہیں ہو گا' پھر بھی مٹی سے برآمد ہونے والی چیز کا تجسّس بہت ہوتا ہے' سب لوگ صندوق کے قریب سمٹ آئے تھے۔ حوالدار نے مراد کی طرف دیکھا' مراد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے مٹی ہٹانے کو کہا۔ اس نے کھرپے کی مدد سے مٹی ہٹانی شروع کی۔ کوئی تین انچ نیچے صندوق کی ٹوٹی ہوئی چھت نظر آئی۔ حوالدار نے چھت کو اوپر کی طرف موڑنا چاہا تو وہ خستہ بسکٹ کی طرح ٹوٹ گئی۔ اب صندوق کے اندر کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں ..... مراد کی نگاہوں میں جھماکا سا ہوا اور ساتھ ہی اس کی ٹانگ میں نہایت شدید ٹیس اٹھی اس کا دل حیرت انگیز شدت سے

دھڑک رہا تھا' اس نے ایک بار پھر صندوق کی سطح پر نظریں جمائیں۔ نہایت غور سے پوری پوری توجہ کے ساتھ' یہ ایک خاکستری کپڑا تھا' اس پر کچھ پھول بوٹے بنے ہوئے تھے لیکن اس کو دیکھ کر اس کا دل کیوں دھڑکا تھا ..... اس کی ٹانگ میں ٹیس کیوں اٹھی تھی ..... کیا کچھ ہونے والا تھا ..... ہاں شاید کچھ ہونے ولا تھا۔ وہ اس خاکستری چادر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس چادر کو اور اس پر بنے ہوئے بیل بوٹوں کو نہیں جانتا تھا' یا شاید یہ چیزیں اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھیں لیکن ایک بات وہ اچھی طرح جانتا تھا ..... وہ جانتا تھا کہ اس چادر کے بعد جو چیز اس کی آنکھوں کے سامنے آنے والی ہے وہ اسے چونکا دے گی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا ..... وہ چیز دیکھتے ہی ایک سویا ہوا جہان انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے گا۔ اس کی نظریں حوالدار کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں' حوالدار نے احتیاط سے چادر ہٹائی ..... چادر کے نیچے کوئی سفید سی چیز تھی۔ کیپٹن مراد کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں ..... ذہن کا کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں ہزاروں لاکھوں ضربیں تقسیمیں کر رہا تھا۔ لاکھوں' کروڑوں لمحوں کا حساب جوڑا جا رہا تھا ..... اربوں اندازے لگائے جا رہے تھے اور اس کی نظریں حوالدار کے ہاتھوں پر مرکوز تھیں' حوالدار کے ہاتھوں میں ایک سفید کُرتہ نظر آ رہا تھا۔ چار پانچ سال عمر کے بچے کا کُرتہ' بغیر گلے کا کڑھائی دار کُرتہ ..... سفید ململ کا بنا ہوا کرتہ حوالدار کے ہاتھوں میں لہرا رہا تھا۔ ذہن کا کمپیوٹر مصروف تھا۔ یہ کرتہ اس کے CPU میں تھا اس کے حافظے میں موجود تھا لیکن کہاں کب ..... اس کی ٹانگ میں اب متواتر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' پھر وہ بے قابو ہو کر آگے بڑھا۔ وہ صندوق کے قریب بیٹھ گیا اور جلدی جلدی چیزیں ہٹانے لگا' کپڑے ..... چھوٹے بڑے' رنگین' سادہ' پھر اس کی نظر دو چھوٹے چھوٹے بکسوں پر پڑی' سرخ رنگ کے خوبصورت بکس' یہ بکس کپڑوں کے نیچے بالکل محفوظ رہے تھے۔ اس نے دونوں بکس صندوق سے نکال کر سامنے رکھ لئے' ان کی آب و تاب قائم تھی' ان کے ننھے منے کھٹکے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے' کیپٹن مراد نے بکسوں کی طرف ہاتھ بڑھائے' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ کیپٹن

مراد جس کے نشانے کی بڑے بڑے افسر داد دیتے تھے' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیپٹن مراد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک ڈبہ کھولا' یہ زیورات کا ڈبہ تھا۔ ڈھکنے کے اندر کی طرف آئینہ لگا ہوا تھا۔ نیچے نیلے رنگ کی ویلوٹ تھی' ویلوٹ میں ایک ہار اور دو بُندے جڑے ہوئے تھے۔ کیپٹن مراد کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں زور سے جھپکیں' بُندے اپنی جگہ موجود تھے۔ ہار اپنی جگہ موجود تھا' اب ان زیورات کے ساتھ ساتھ ایک چہرہ بھی مراد کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ چاند کی طرح چمکدار' پھولوں کی طرح خوشبودار اور شہد کی طرح میٹھا چہرہ ..... یہ اس کی ماں کا چہرہ تھا' اسے پیدا کرنے والی ماں کا چہرہ ..... دودھ پلانے والی اور منہ چومنے والی ماں کا چہرہ ..... اس نے انگلیوں کی پوروں سے زیوروں کو چھوا اور اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ پھر اس نے دوسرے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس ڈبے میں ایک جھومر اور دو انگوٹھیاں تھیں۔ انگوٹھیوں کے ساتھ ہی کچھ نوٹ پڑے تھے ..... مڑے تڑے ..... مراد نے ان نوٹوں کو اٹھایا۔ ان کی تہیں کھولیں ..... اسے معلوم تھا کہ تہیں اس کی ماں کے ہاتھوں نے لگائی ہوں گی۔ ان تہوں میں گھر گرہستی' وفا شعاری اور ممتا کے پیار کی دلگداز کہانیاں پوشیدہ تھیں۔ اتنے میں اس کے کانوں میں حوالدار شجاعت کی آواز ٹکرائی وہ خندق سے ایک اور ڈبہ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا یہ ٹین کا ایک گول ڈبہ تھا۔ مراد اس ڈبے کو پہچانتا تھا' اس نے یہ ڈبہ لکڑی کی ایک الماری کے اوپری خانے میں پڑا دیکھا تھا ایک بار نہیں ..... دو بار نہیں' سینکڑوں بار' وہ اس ڈبے کو پہچانتا تھا' وہ اس الماری کو پہچانتا تھا ..... وہ اس گھر کو پہچانتا تھا جہاں وہ الماری تھی۔ ذہن کا کمپیوٹر مصروف تھا وہ اب بغیر کھولے بتا سکتا تھا کہ اس ڈبے میں کیا ہے وہ سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اس ڈبے میں دھاگے کی گولیاں ہوں گی' سوئیاں ہوں گی' بٹن ہوں گے' اس کی ماں اس ڈبے میں یہی کچھ رکھا کرتی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھکن اٹھایا ..... اس میں وہی کچھ تھا جو اس نے سوچا تھا ..... اور اس کے علاوہ ایک پیلا لفافہ بھی تھا' اس نے لفافہ اپنی آنکھوں کے سامنے

[illegible] ایک پتہ لکھا تھا۔ ایڈووکیٹ ملک مختار' مکان نمبر 12 گلی نمبر 6 نجف کالونی [illegible] مدھم پڑ چکی تھی' شہر کا نام تو بالکل نہیں پڑھا جاتا تھا۔ کیپٹن مراد نے [illegible] طرف بھیجنے والے کا نام لکھا تھا۔ شفیع محمد گاؤں و ڈاک خانہ لوہاراں والی۔ [illegible] لوہاراں والی۔ یہ دونوں نام مراد کے ذہن میں دھماکوں کی طرح گونج رہے [illegible] ان ناموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان ناموں کے بارے میں وہ جانتا ہے' وہ نام اس کی شناخت تھے۔ اس کا ضمیر ان ہی ناموں سے [illegible] تھا۔ شفیع محمد ایک لمبا اونچا بھرے بھرے چہرے والا جوان' جس کے کندھوں پر بیٹھ کر [illegible] کرتا تھا تو ہر طرف کا صحن نظر آنے لگتا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا ..... اور لوہاراں والی [illegible] شاید اس کی جنم بھومی تھی' وہی جنم بھومی جس کی گلیوں میں اس کا بچپن بکھرا [illegible] تھا۔ وہ [illegible] کے خواب وہ جاگتی آنکھوں سے ہزار بار دیکھ چکا تھا۔ وہ دھندلی [illegible] مٹی سے بھرے ہوئے گھر' برگد کا ایک بوڑھا [illegible] اس کی ٹانگ میں [illegible] ایک ٹیس اٹھی' اس نے سر اٹھایا' تمام جوان اور افسر حیرت [illegible] اس کی طرف دیکھ رہے تھے [illegible] میتوں میں کام کرتے ہوئے چند دیہاتی بھی جھمگٹا [illegible] اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے لیکن اسے ان کی حیرانی [illegible] بادلوں کے اس پار جہاں بادل اور [illegible] سے گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی وہاں تک جاتی [illegible] وہ اس پگڈنڈی کو جانتا ہے۔ ایکا ایکی اسے سارا منظر مانوس سا [illegible] اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"حوالدار! لوہاراں والی کہاں ہے؟"

"لوہاراں والی!" حوالدار منہ میں بڑبڑایا۔

"جناب! یہ نالے کے دوسری طرف والا گاؤں لوہاراں والی ہی تو ہے۔" ایک دیہاتی بولا۔

"سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے!" ادریس اسے کندھے سے تھام کر بولا۔

مراد نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ٹھیک ہوں ادریس' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس کی سوچ دور پہنچی ہوئی تھی ..... وہ سوچ رہا تھا خندق سے برآمد ہونے والی کھوپڑی کس کی تھی؟ کیا یہ اس کے کسی پیارے کی کھوپڑی تھی' اس کی بلائیں لینے والی ماں کی؟ اسے کندھے پر اٹھانے والے باپ کی؟ بڑے بھائی شمشاد کی؟ وہ کانپ کر رہ گیا' لیفٹیننٹ کی آواز نے اسے چونکا دیا وہ کہہ رہا تھا۔

"جناب لگتا ہے آپ کو یہ چیزیں دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے۔ دراصل اس علاقے میں پہلے بھی ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ پچھلے سال بھی خندقوں کی کھدائی کے دوران یہاں سے ہڈیاں ملی تھیں۔ یہ علاقہ پچھلے چالیس سال سے کئی مرتبہ جنگ کی زد میں آ چکا ہے۔ افراتفری میں گھروں سے بھاگنے والے بے شمار سویلین یہاں ہلاک ہوتے رہے ہیں' سن 47ء کے فسادات میں بھی یہاں خوفناک کشت و خون ہوا تھا۔" لیفٹیننٹ بول رہا تھا اور مراد کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں' کبھی سب کچھ خواب اور کبھی ہر شے حقیقت لگتی تھی۔ ذہن اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وہ اتفاقاً اپنے بزرگوں کے نشان ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن نظر کو جھٹلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ کس کس چیز کو جھٹلا سکتا تھا۔ [illegible] کی رنگ کی چادر سے لے کر چھوٹے چھوٹے بٹنوں تک ہر چیز اس کے سامنے پڑی تھی ..... نہیں ..... نہیں کہیں یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ تو نہیں۔ اس کے تعلیم یافتہ ذہن نے نقطہ اٹھایا۔ ہو سکتا ہے اس کی ناکام آرزوئیں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ بچپن میں بادلوں کے ٹکڑے بھی تو عجیب شکلیں اختیار کر لیا کرتے تھے۔ سوچ کہیں کی نہیں بھٹک رہی تھی۔

"صاحب کوئی یاد آ گیا ہے؟" اردلی محمد حسین نے بڑے پیار سے پوچھا۔ وہ پھر چونک کر خیالوں سے باہر آ گیا' پیلا لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"لوہاراں والی کتنی دور ہے یہاں سے؟" مراد نے اس دیہاتی سے پوچھا۔ اس کی آواز میں عجیب طرح کی عجلت تھی۔

"جناب یہی کوئی تین میل کا فاصلہ ہو گا۔"

"عبداللہ' جیپ نکالو۔" مراد نے ڈرائیور سے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

لیفٹیننٹ ادریس نے آسمان پر نگاہ دوڑائی' سورج گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور تیز ہوا چلنے لگی تھی۔

"سر! آندھی آ رہی ہے' اس وقت جانا ٹھیک نہیں۔"

"مجھے سبق مت پڑھاؤ۔" مراد غصے سے بولا۔ "یہ تمام چیزیں صندوق میں رکھ کر بڑی احتیاط سے میرے خیمے میں پہنچوا دو ..... فوراً۔"

تمام عملہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "چلو تم سب لوگ باقی کا کام کرو لیکن اس کونے میں کوئی کھدائی نہ کرے ..... سن لیا تم نے؟"

"یس سر!" کئی آوازیں ابھریں' جیپ سٹارٹ ہو چکی تھی' مراد تیز قدموں سے چلتا ہوا جیپ میں بیٹھا' تھوڑی دیر بعد وہ ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے کچے راستے پر جا رہی تھی۔

جس وقت جیپ گاؤں میں پہنچی زبردست آندھی کے بعد موسلادھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ مراد نے ڈرائیور کو ایک درخت کے نیچے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر جیپ سے اتر کر گاؤں کے اندر داخل ہو گیا' گاؤں کے باسی گھروں میں دبکے ہوئے تھے' پرنالوں سے لگاتار پانی بہہ رہا تھا' کچی گیلی گیلی دیواروں سے بھوسے کے چمکدار تنکے جھانک رہے تھے' عصر کا وقت تھا لیکن لگتا تھا شام ہو گئی ہے' مراد کی نگاہیں در و دیوار سے چپکی ہوئی تھیں' ذہن کا کمپیوٹر ہزارہا مدھم نقوش کی پراسیسنگ میں مصروف تھا۔ وہ ایک سیدھی گلی میں چلتا رہا۔ پانی میں شرابور' کیچڑ میں لت پت' کوئی انجانی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک موڑ پر پہنچ کر اسے شک ہوا کہ یہ جگہ اس کی دیکھی ہوئی ہے۔ وہ دو قدم اور آگے بڑھا' اس نے آنکھیں بند کیں اور اسے اندازہ ہوا کہ اس موڑ کے دائیں طرف کوڑے کرکٹ کا ایک ڈھیر ہو گا اور ڈھیر کے ساتھ ایک بیری کا درخت' وہ ایک خوش کن تجسس کے ساتھ آگے بڑھا لیکن یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ نہ تو وہاں کوڑے کا ڈھیر تھا اور نہ بیری۔ ایک مکان کے اوپر کبوتروں کا بڑا سا جال دار ڈربہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بار

پھر متذبذب نظر آنے لگا' اس کے ذہن نے کہا۔ "مسٹر مراد! گاؤں جیسے گاؤں اور گلیوں جیسی گلیاں ہوتی ہیں۔ گلیوں میں ایسے ہی گھر ہوتے ہیں اور گھروں میں ایسے ہی صندوق اور صندوقوں میں ایسے ہی کپڑے ..... نہ جانے کتنی مائیں اور کتنے بیٹے اب تک بچھڑے ہیں اور بچھڑتے رہیں گے۔ تمہیں ملنے والی نشانیاں نہ جانے کس ماں اور کس بیٹے سے تعلق رکھتی ہیں ..... لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا' عین اس وقت اس کی نگاہ ایک بھٹی پر پڑی۔ دانے بھوننے والی یہ بھٹی اس وقت بالکل سرد تھی' اس میں آگ کی جگہ بارش کا پانی فراٹے بھر رہا تھا۔ مراد کچھ دیر بھٹی کو دیکھتا رہا۔ ذہن نے کہا کہ اس بھٹی کی سیدھ سے جو گلی نکلتی ہے وہاں ایک پکی اینٹوں کا مکان ہو گا' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھٹی کے پاس پہنچا' اس کا دل دھڑک رہا تھا' بھٹی پر پہنچ کر اس نے گلی میں جھانکا ..... کوئی آدھ فرلانگ دور گلی کے خم پر پکی اینٹوں والا مکان نظر آ رہا تھا۔

"اوہ گاڈ ....." اس کے منہ سے نکلا اس کے چہرے پر ایک معصوم بچے کی خوشی نمودار ہوئی۔ یہی اس کی جنم بھومی تھی۔ انہی فضاؤں میں اس کا بچپن گم تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر پکے مکان کی طرف بھاگنے لگا ..... اسے معلوم تھا جب وہ پکے مکان کی سیدھ میں کھڑا ہو کر دیکھے گا تو بابے ..... بابے گلو شاہ کا مزار اور اس کا جھنڈا نظر آئے گا' وہ پکے مکان کے پاس پہنچا' اس نے بارش کی دبیز چادر میں سے دیکھا گلو شاہ کے مزار پر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی طرح تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ بالکل آج سے بیس سال پہلے کی طرح' وہ مزار کی طرف بھاگا' مزار پر پہنچ کر وہ دائیں بائیں مڑا۔ برگد کا درخت نظر آ رہا تھا۔ وہ برگد کے درخت کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ اس وقت سامنے سے ننگ دھڑنگ بچوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی وہ مستی میں سرشار نعرے لگا رہے تھے۔ کالیاں اِٹاں کالے روڑ مینہ وسادے زورو زور۔ انہوں نے ایک فوجی افسر کو بھیگے کپڑوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئے' لیکن مراد نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ شاید ان کے درمیان تھا ہی نہیں' وہ بیس سال پہلے کے لوگوں میں تھا

..... ہاں بیس سال پہلے ..... ابھی 6 ستمبر 1965ء کا دن نہیں آیا تھا' ابھی رات کے اندھیرے میں موت کی روشنی نہیں لپکی تھی' ابھی ان کے گاؤں پر سے آتشیں گولوں کی سواریاں نہیں گزری تھیں۔

ابھی مشین گنوں کی گولیوں نے پناہ ڈھونڈنے والوں کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے جدا نہیں ہوا تھا ..... ابھی اس کا باپ زندہ تھا۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی' وہ بابا گلو شاہ کے مزار پر تیل چڑھا کر واپس جا رہا تھا' برگد کے درخت سے وہ دائیں جانب مڑ جائے گا' سامنے ایک گلی ہو گی گلی کے آخری سرے پر ایک تھے (ٹیلہ) ہو گا' تھے کے اوپر پہلا گھر اس کا ہو گا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا گھر' دروازے پر اس کی ماں کھڑی ہو گی ..... اس کی رفتار میں تیزی آ گئی' وہ برگد کے پاس جا کر گھوما' سامنے ایک گلی تھی' گلی کے آخری سرے پر ایک تھے تھا' تھے کے اوپر ایک چھوٹا سا مکان تھا لیکن دروازے پر اس کی ماں نہیں تھی' ہوتی بھی کیسے؟

کیپٹن مراد نے اپنے ذہن کو جھٹکا' وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ یہاں تک بے تکان بھاگتا ہوا آیا تھا ..... ننگ دھڑنگ بچوں کا گروہ اس کے پیچھے تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کیپٹن مراد نے اپنی سانسیں درست کیں ..... پھر آہستہ قدموں لیکن تیز دھڑکنوں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا ..... اس کا سارا جسم لرز رہا تھا' وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی دستک پر دروازہ کون کھولے گا' اس کی برسوں سے بچھڑی ہوئی ماں' اس کا باپ' اس کا بھائی یا کوئی اور ..... اس نے ایک نظر بچوں کی طرف دیکھا ..... وہ اب عجیب خوفزدہ انداز سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے ..... جونہی اس نے بند دروازے پر دستک دی بچے چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔

بارش کی تیز بوچھاڑیں براہِ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں' خاکی وردی بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئی تھی' اس کا سارا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا اس دروازے کی دوسری طرف کیا تھا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا لیکن در و دیوار سے ایک بھینی بھینی جانی پہچانی خوشبو آ رہی تھی وہ اس خوشبو کے لئے پوری زندگی یہاں کھڑا رہ سکتا تھا۔ یہ اس

کے بچپن کی خوشبو تھی' اس کے گزرے دنوں کی مہک تھی' اس کی نظریں ایک بار پھر بند دروازے پر مرکوز ہو گئیں' دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا یہ دروازہ کون کھولے گا' اس کا مہربان باپ؟ اس کی شفیق ماں' اس کا عزیز بھائی؟ یا کوئی اور ..... اس نے ایک بار پھر دستک دی' وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا شاید چند گھڑیاں' لیکن اسے لگ رہا تھا وہ سالوں سے یہاں کھڑا ہے۔ پھر اس نے کچھ پیچھے ہٹ کر مکان کے در و دیوار پر نظر دوڑائی' ایک ایک دیوار' ایک ایک کونہ' ایک ایک خط اس کا جانا پہچانا تھا۔ ہاں یہی اس کا گھر تھا ..... لیکن یہ گھر ایسا خاموش تو نہیں تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب ایسا سکوت تو نہیں تھا' یہاں تو ہر وقت میلے کا سماں رہتا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں اس کی ماں کے پاس قرآن مجید پڑھنے آتی تھیں' صبح کے وقت لسی لینے والوں کی آمدورفت رہتی تھی' شام کے وقت گاؤں کی عورتیں ان کے صحن میں تندور پر روٹیاں پکاتی تھیں' یہ گھر تو بڑا بارونق تھا' یہاں کا دروازہ تو کبھی بند نہیں ہوتا تھا اس کی شامیں تو کبھی تاریک نہیں ہوتی تھیں' اس نے ایک بار پھر دستک دی' اس دفعہ قدرے زور سے اور پیچھے ہٹ کر دیوار کے دوسری طرف دیکھنے لگا' تاریکی ایک دم گہری ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک کمرے کی کھڑکی پر مرکوز تھیں۔ یہ کمرہ "تھے" کی ڈھلان پر واقع تھا اور باقی مکان سے کچھ بلند تھا۔ اس کی ماں اس کھڑکی میں بیٹھ کر پڑوس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اسی کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھ کر وہ اور اس کا بھائی شمشاد صحن میں گھومتی مرغیوں کو آٹے کی گولیاں پھینکا کرتے تھے اور جب محلے کے بچے ان کی دیوار کے ساتھ کانچ کی گولیاں کھیلتے تھے تو اس کا باپ اسی کھڑکی میں کھڑا ہو کر انہیں گرجدار آواز میں ڈانٹا کرتا تھا ..... اور ..... اور یہی وہ کھڑکی تھی ..... ایک دم اس کے پردہ ذہن پر ایک معصوم شبیہہ ابھری' شہد رنگ بالوں والی ایک ننھی منی لڑکی کی شبیہہ' کتنے سرخ ہونٹ تھے اس کے' ہاں یہی وہ کھڑکی تھی جس میں کھڑا ہو کر وہ مسرت کو آواز دیا کرتا تھا ..... "آؤ گھر گھر کھیلیں' آؤ گھر گھر کھیلیں۔" یہ آواز اسے جسم کے ہر مسام سے پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے پچھلے بیس سالوں میں اس نے یہ آواز بارہا سنی ہے۔ یہ کس کی آواز تھی۔

شاید اس کی اپنی' یا شاید سرخ ہونٹوں والی اس لڑکی کی' ..... لیکن اس وقت کھڑکی خاموش تھی' بند اور بالکل اداس' وہ اس کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس کے کھلنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب وہ تیسری بار دستک دینے کے لئے آگے بڑھنا چاہتا تھا' کھڑکی میں حرکت پیدا ہوئی' اس کے پٹ کھلے' مراد کی تمام حسیں آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ کھڑکی کے دوسری طرف تاریکی تھی' پھر روشنی کی لکیر نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں مٹی کا دیا لئے کوئی کھڑکی میں نظر آیا' مراد نے غور سے آنے والے کا چہرہ دیکھا' وہ ایک عورت تھی' بال بالکل سفید اور چہرے پر بکھرے ہوئے' جسم بالکل ساکت' بارش کی تیز بوچھاڑوں کے اندر سے مراد اس چہرے کو دیکھتا رہا۔ دھندلے دھندلے اس چہرے کو اتنی دور سے اور اتنی تاریکی میں پہچاننا ممکن نہیں تھا لیکن وہ مراد کی آنکھیں تھیں اور وہ مراد کی ماں کا چہرہ تھا۔ وہ اسے کیوں نہ پہچانتا' اس کی آنکھیں دھوکا کھا سکتی تھیں لیکن اس کے دل کو کون دھوکا دے سکتا تھا۔ ہاں یہ اس کی ماں کا چہرہ تھا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی۔ "ماں ..... ماں ....." اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ "دروازہ کھولو۔" لیکن کھڑکی میں نظر آنے والا جسم ساکت رہا۔

"ماں' دروازہ کھولو۔" وہ اپنی بھاری لیکن لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

عورت پھر بھی خاموش رہی' یوں لگتا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں' مراد نے پھر غور سے عورت کا چہرہ دیکھنا چاہا ..... لیکن یہ کیا' کھڑکی تو بند تھی۔ اس نے زور سے آنکھیں جھپکیں۔ کیا اسے دھوکا ہوا تھا ..... نہیں' عورت کھڑکی میں موجود تھی اس کی نظر اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ دھوکا کھاتا' کھڑکی اس کے سامنے کھلی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی' اور اس وقت اس نے پہلی بار دیکھا کہ دروازے کے اوپر کنڈی میں تالا لگا ہوا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا کچھ سمجھ نہیں آئی' تب ایک ساتھ والے گھر کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک باریش شخص دہلیز پر نظر آیا' اس نے بارش سے بچنے کے لئے سر پر بوری اوڑھ رکھی تھی' وہ چند لمحے خوفزدہ نظروں سے مراد کو دیکھتا رہا پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بیٹے یہ دروازہ تم نے کھٹکھٹایا تھا؟"

"جی ہاں!" مراد نے کہا۔

"لیکن بیٹے! تم نے دیکھا نہیں' اوپر تالا لگا ہوا ہے۔"

"بزرگوار' تالا تو لگا ہوا ہے لیکن گھر والے اندر موجود ہیں۔"

"نہیں بیٹے' یہ گھر بالکل خالی ہے ..... یہاں کوئی نہیں رہتا۔"

"میاں جی! میں نے اپنی آنکھوں سے کھڑکی میں ایک عورت کو دیکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مراد پھر دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے آگے بڑھا۔ اس وقت بوڑھے نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"بیٹے! تم اجنبی معلوم ہوتے ہو ..... آؤ میرے ساتھ میں تمہیں ساری بات بتاؤں۔"

وہ اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنے دروازے تک لے گیا پھر اس نے دروازہ کھولا اور صحن میں داخل ہو گیا' سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھیں' لڑکی اسے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی' بوڑھا اسے لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا' عورت بھی اس کے ساتھ ہی اندر آئی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"پُتر! تم نے دروازہ کیوں کھٹکھٹایا' تمہیں کچھ پتہ نہیں؟" وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اللہ معاف کرے' یا اللہ سب کی خیر!" وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔

"برکتے! تُو دوسرے کمرے میں جا۔" بوڑھا ذرا غصے سے بولا۔ عورت باہر نکلی تو وہ بلند آواز میں بولا۔ "ریاست کے کپڑے باؤ جی کو لا دے ان کی وردی بھیگ گئی ہے۔"

"نہیں میاں صاحب مجھے کپڑوں کی ضرورت نہیں' آپ وہ بات بتائیں جس کے لئے مجھے یہاں لائے ہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں اب بھی خوف جھانک رہا تھا اس نے کہا۔ "بیٹا! پہلے اپنے بارے میں بتاؤ تم کون ہو' اور یہاں کیسے آئے ہو؟"

مراد نے طویل سانس لے کر کہا۔ "میاں جی! میرا نام مراد ہے' جس گھر کے دروازے پر میں دستک دے رہا تھا وہ میرا گھر ہے' میرے باپ کا نام محمد شفیع ہے اور بڑے بھائی کا نام شمشاد' 65ء کی جنگ میں مَیں گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا' آج 20 سال بعد اتفاقاً مجھے اپنے گاؤں کا پتہ چلا ہے ..... آپ میرے والد کو جانتے ہیں؟"

بوڑھا حیرت بھری نظروں سے مراد کو دیکھ رہا تھا' پھر اس کی طرف انگلی اٹھا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم ..... تم مراد ہو' شفیع کے چھوٹے بیٹے؟"

"جی ہاں!" مراد نے جواب دیا' بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر مراد کی پیشانی اور سر پر لگاتار بوسے دینے لگا ..... بوڑھی عورت اور نوجوان لڑکی بھی شاید دروازے کی اوٹ سے ساری باتیں سن رہی تھیں وہ اندر آ گئیں' عورت حیرت سے بولی۔ "یہ محمد شفیع کا پتر مراد ہے!" پھر وہ بھی مراد کی بلائیں لینے لگی۔ نوجوان لڑکی نے شرما کر سلام کیا' مراد سب کچھ ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا' عورت اس سے پتہ نہیں کیا کیا سوال پوچھ رہی تھی۔ "تم کہاں تھے' کیسے گئے تھے' کہاں رہے تھے۔" مراد کو لگ رہا تھا جیسے وہ ایک طویل خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور وہ اپنی چھولداری میں پڑا ہو گا۔ اردلی محمد حسین آ کر کہے گا کیپٹن صاحب اٹھئے مغرب کی اذان ہو گئی ..... ایکا ایکی زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھیں جھپک کر لڑکی کی طرف دیکھا' اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا' لڑکی کی بائیں ابرو کے اوپر ایک چھوٹا سا مسّہ تھا ..... یہ مسّہ دیکھتے ہی جیسے ذہن کے کچھ بند دروازے دھماکوں سے کھل گئے' وہ حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا' پھر بوڑھے کی طرف مڑا۔

"آپ ..... چچا ..... چچا طفیل تو نہیں؟"

"ہاں ..... ہاں ....." بوڑھا جوش سے بولا۔ "بڑی یادداشت ہے تمہاری' اور یہ تمہاری چچی برکتے ہیں' ایک دفعہ تم نے اس کی کنپٹی پر گلی ڈنڈا مارا تھا۔"

"گلی ڈنڈا نہیں' صرف گلی۔" نوجوان لڑکی نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔ مراد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' لڑکی کی گود میں اب ایک بچہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ

بچے کے پیچھے چھپا ہوا تھا وہ ایک آنکھ سے مراد کو دیکھ رہی تھی' ابرو کے اوپر کا مسہ مراد کو بہت کچھ یاد دلا رہا تھا۔

"یہ تمہارا بچہ ہے؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"ہاں' یہ اس کا چھوٹا لڑکا ہے۔" چچی برکتے نے جواب دیا۔

"ماموں کو سلام کرو۔" لڑکی نے ڈیڑھ دو سالہ بچے کا رخ مراد کی طرف پھیرا۔ اس نے شرما کر لمبی سی زبان نکال دی ..... چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔

"بلقیس پر گیا ہے' بچپن میں یہ بھی ایسی ہی ہوتی تھی۔" چچی برکتے نے کہا۔

اور تب مراد کو لڑکی کا نام یاد آیا' اس کا نام بلقیس تھا اور بچپن میں وہ اسے بسیو کہتے تھے' وہ مسرت کی بڑی پکی سہیلی تھی ..... اچانک مراد کے ذہن کو جھٹکا سا لگا' اس نے سوچا بلقیس اور مسرت ہم عمر تھیں' اگر بلقیس شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہے تو مسرت.....؟

لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر اپنے گھر کے بند دروازے' کھڑکی' اور اس میں نظر آنے والی عورت کی طرف چلا گیا تھا' بوڑھے نے بھی اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا' اس نے دونوں عورتوں کو اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گئیں' بوڑھا جب دروازہ بند کر کے واپس مڑا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ وہ مراد کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

"بیٹے! میں تم سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے تم اپنے گھر بار کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو۔ اس لئے باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" بوڑھے نے رک کر حقے کے دو تین کش لئے اور بولا۔

"مراد بیٹے! میرے پاس تمہیں سنانے کے لئے کوئی اچھی خبریں نہیں ..... جیسا کہ شاید تمہیں معلوم ہو جنگ شروع ہونے پر سارا گاؤں خالی ہو گیا تھا' کئی مہینے بعد لوگ اس گاؤں میں واپس آئے لیکن کچھ دوسرے گھروں کی طرح تمہارا گھر بھی خالی رہا۔

پھر دو تین مہینے بعد تمہاری ماں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتی اپنے گھر واپس آئی۔ وہ ہر وقت اپنے شوہر اور دونوں بچوں کو یاد کرتی رہتی تھی' اسے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا' اس کا دکھ گاؤں کے سب لوگ محسوس کرتے تھے' لیکن کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا پھر اس نے گاؤں کے ایک لڑکے کو لے پالک بنا لیا۔ وہ اس سے بڑی محبت کرتی تھی' اس کا نام شیرو تھا' وہ بڑا کڑیل اور صحت مند جوان نکلا لیکن اس کی عادات کچھ اچھی نہیں تھیں۔ برے دوستوں کی صحبت نے اسے آوارہ گرد بنا دیا تھا' کہا جاتا ہے کہ وہ بارڈر بھی پار کرتا رہتا تھا' دو تین سال پہلے اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ ایکا ایکی شیرو غائب ہو گیا' یہ آج سے کوئی آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے' شیرو کے غائب ہونے کے چند روز بعد ایک عجیب و غریب واقع رونما ہوا ایک روز تمہاری ماں اپنے گھر میں بے ہوش پائی گئی۔ اسے کسی نے بری طرح مارا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ ہم نے سمجھا شاید یہ چوٹوں کا اثر ہے۔ پوچھنے پر وہ بتاتی تھی کہ اسے کالے کپڑے والوں نے مارا ہے۔ دوسرے تیسرے روز پھر وہی واقعہ پیش آیا' رات کو ہم نے تمہارے گھر سے چیخوں کی آواز سنی' جب وہاں پہنچے تو تمہاری ماں زمین پر پڑی تھی اور اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا' تمام جسم پر چوٹوں کے نشان تھے' کوئی شخص قریب موجود نہ تھا ہم لوگ خوفزدہ ہو گئے اور اسی وقت اسے بابا گلو شاہ کے مزار پر لے گئے' مزار کے گدی نشین حضرت پیر سائیں بڑے نیک اور روشنی والے انسان ہیں' انہوں نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ عورت سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی اسے یہ سزا مل رہی ہے۔ بعد ازاں ان کے خاص مریدوں سے پتہ چلا کہ عورت پر جنات کا سایہ ہے۔"

یہاں تک کہہ کے بوڑھا طفیل خاموش ہو گیا' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے۔

مراد نے کہا۔ "چچا طفیل! تمہیں قسم ہے مجھ سے کچھ نہیں چھپانا ..... اگر بتانے لگے ہو تو پوری بات بتاؤ۔"

بوڑھے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مراد! تم بیٹے ہو' تم اپنی ماں کے بارے کوئی ایسی بات سننا پسند نہیں کرو گے ..... میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی۔"

"چچا میں بچہ نہیں' سچ اور جھوٹ کی تمیز کر سکتا ہوں' تم مجھے ہر بات بتاؤ۔"

"بیٹے!" بوڑھا پھر جھجک کر خاموش ہو گیا' پھر جیسے ایک دم ہمت کر کے بولا۔ "مراد! تمہاری ماں کے منہ بولے بیٹے کا ایک دوست....."

مراد کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے وہ یہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں سنا لیکن جو اس نے سنا تھا وہ ایک آہنی میخ کی طرح اس کے ذہن میں پیوست ہو چکا تھا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور حلق میں گرنے والے آنسوؤں کا گھونٹ بھر کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آگے کہو چچا طفیل!"

"بیٹے! اس کے بعد تمہاری ماں کی حالت اور خراب ہو گئی' تھوڑے تھوڑے دنوں بعد اسے دورے پڑتے رہے' اس دوران میں بھی ایک دو بار اس سے ملنے گیا' وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی تھی' بار بار یہ فقرہ دہراتی رہتی تھی' مجھے مت مارو ..... مجھے کچھ پتہ نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات بھی دیکھی' اسے جہاں کوئی کاغذ کا ٹکڑا پڑا نظر آتا تھا وہ بھاگ کر اسے اٹھا لیتی تھی اور دوسروں سے کہتی تھی' یہ لو ..... یہ لے لو۔ بعض اوقات وہ مارنے کو بھی دوڑتی تھی ..... پچھلی سردیوں کی بات ہے ایک دن ساتھ والے گاؤں کے کچھ لوگ اسے چارپائی پر ڈال کر لائے۔ دراصل وہ رات کے وقت گاؤں سے نکلی تھی اور نہر میں کود کر جان دینے لگی تھی' اس دن کے بعد سے حضرت صاحب نے حکم دیا کہ عورت کو گھر سے نہ نکلنے دیا جائے' اسے ایک کمرے میں زنجیر کے ساتھ باندھ دیا جائے اور باہر کے دروازے پر تالا لگا دیا گیا ..... اس تالے کی چابی حضرت سائیں کے ایک خاص مرید کے پاس ہے اب وہی دروازہ کھولتا ہے اور جنتے کو کھانا وغیرہ پہنچاتا ہے' اس کے علاوہ کوئی اس کے پاس جانے کی جرأت نہیں کرتا۔"

مراد بڑی توجہ سے یہ باتیں سن رہا تھا' بوڑھے کے خاموش ہونے پر گھمبیر آواز میں بولا۔ "بھوت پریت' جنات کا سایہ۔" یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہا

ہے' اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی سرخی ڈھلک آئی تھی' پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

"لیکن چچا طفیل! کیا ہمارا کوئی اور رشتے دار کبھی یہاں نہیں آیا؟"

بوڑھے طفیل نے حقے کا ایک طویل کش لیا' پھر زور سے کھانس کر بلغم کا ایک ٹکڑا سامنے دیوار کی جڑ میں تھوک دیا' کندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے ہونٹ صاف کئے اور بولا۔

"بیٹے مراد! تمہاری ماں کا ایک بھائی اکثر آیا کرتا تھا دو پھوپھیاں بھی کبھی کبھار آتی تھیں' اس کے علاوہ تمہارا ایک چچا اس گاؤں میں ہی موجود تھا لیکن چار پانچ سال ہوئے وہ کہیں چلا گیا ہے' تمہاری ماں کے بھائی یعنی تمہارے ماموں کا قصہ بڑا دردناک ہے۔ گاؤں والوں کو ابھی تک وہ منظر نہیں بھولا۔ اللہ معاف کرے اس کی لاش دیکھی نہیں جاتی تھی یوں لگتا ہے جیسے اب بھی گاؤں کی گلیوں میں اس لاش کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ چچا!"

"بیٹے! دراصل تمہارے ماموں نے اپنی جان پر خود ظلم کیا۔ اس نے حضرت سائیں کی بات نہیں مانی اور دردناک موت سے دوچار ہوا ..... حضرت سائیں کا حکم ہے کہ کوئی جنتے کے قریب نہ جائے ورنہ اس کا عذاب دوسرے کو بھی لپیٹ میں لے لے گا۔ سب سے پہلے گاؤں کی ہی ایک عورت نے نافرمانی کی' وہ جنتے کی پڑوسن ہے ایک رات جنتے کی چیخیں بلند ہوئیں تو اس نے تمہارے گھر کے صحن میں سیڑھی لٹکائی اور اندر چلی گئی۔ "ہوائی چیزوں" نے اسے اٹھا کر اس کے گھر میں لا پھینکا' اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سارے جسم پر نیل پڑ گئے۔ پھر ایک لڑکی جو بچپن میں تمہاری ماں سے قرآن مجید پڑھا کرتی تھی کوٹھا پھلانگ کر تمہارے گھر میں داخل ہوئی اسے بعد میں اتنا تیز بخار چڑھا کہ تین دن بے ہوش رہی' جب اس کی زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس کی ماں اسے حضرت سائیں کے پاس لے گئی' حضرت سائیں نے ترس کھا کر اس کے لئے دعا کی اور اس کی جان بچ گئی اور تو اور مسجد کے امام صاحب بھی خود کو اس کی نحوست سے نہ بچا سکے۔ حضرت سائیں کی مرضی کے خلاف وہ جنتے کو دم کرنے کے لئے اس کے گھر گئے'

اُس روز کے بعد آج تک انہیں کسی نے نہیں دیکھا' تمہارے ماموں نے بھی یہی غلطی کی' اس نے کہا کہ میں اپنی بہن سے ملوں گا مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے حضرت سائیں کے مریدوں کا لگایا ہوا تالا توڑ دیا اور اندر چلا گیا' وہ کوئی دو گھنٹے بعد باہر نکلا اور خاموشی سے ایک طرف چلا گیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے اور منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی' پھر کوئی ایک ہفتے بعد کسی مسافر نے اطلاع دی کہ راوی کے کنارے درختوں میں ایک پھولی ہوئی لاش پڑی ہے۔ پولیس موقعے پر پہنچی اور لاش کو قبضے میں لے لیا۔ یہ تمہارے ماموں کی لاش تھی۔ بازو پر گھڑی اور ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی اسی طرح موجود تھی۔ اس کے سر پر ایک بہت گہرا زخم تھا' جو پتہ نہیں کس چیز کا تھا' دوسرے روز پتہ چلا کہ کچھ لوگوں نے پولیس کو اپنی گرفتاری پیش کی ہے یہ چار آدمی تھے اور چوری چکاری کرتے تھے۔ سنا ہے انہوں نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ چار دن اس لاش کے ہاتھوں سے انگوٹھی' گھڑی وغیرہ اتارنے کے لئے جاتے رہے لیکن وہ جب بھی وہاں گئے تو انہوں نے ایک بوڑھی عورت کو ہاتھ میں ننگی تلوار لئے لاش کا پہرہ دیتے دیکھا' وہ عورت لاش کے گرد چکر لگاتی تھی اور کبھی اچانک نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی' وہ اس منظر سے اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلی اور خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا ..... جب تمہارے ماموں کی لاش گاؤں میں لائی گئی تو کئی عورتیں اور بچے اس کی بگڑی ہوئی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئے' اس کے چہرے کا گوشت الٹے توے کی طرح سیاہ ہو رہا تھا' بدبو اس قدر زیادہ تھی کہ گاؤں کے لوگ گھروں سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگ گئے....."

اچانک کچھ دور سے چیخوں کی مدھم آواز سنائی دی اور بوڑھا طفیل خاموش ہو گیا' مراد نے کان لگا کر سنا یہ آواز اس کے گھر سے آ رہی تھی۔ کوئی بَین کرنے کے انداز میں زور زور سے رو رہا تھا' آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا نوحہ تھا' اداس اور پُراسرار نوحہ' ہوا کے دوش پر ڈوبتی ابھرتی آواز کوئی مافوق الفطرت کہانی سنا

رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ آواز مدھم ہوئی اور بتدریج معدوم ہو گئی۔ مراد کی سرخ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ بوڑھے نے غمناک لہجے میں کہا۔

"مراد یہ جنتے کی آواز تھی ..... تمہاری ماں کی ..... کئی بار یہ آواز رات رات بھر سنائی دیتی رہتی ہے' خاص طور پر اندھیری راتوں میں یہ گریہ زاری بڑی خوفناک لگتی ہے' لگتا ہے کوئی دیواروں سے سر ٹکرا رہا ہے اور زمین پر دوہتڑ برسا رہا ہے۔"

دفعتاً مراد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا' لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں' سانس تیزی سے آ جا رہی تھی' کشادہ سینے کی دیوار کے پیچھے دل کا نقارہ پوری شدت سے بج رہا تھا' وہ ٹھہری ہوئی پُرعزم آواز میں بولا۔ "میں ماں سے ملنے جا رہا ہوں چچا!"

بوڑھے نے جلدی سے آگے بڑھ کر مراد کا بازو تھام لیا۔ "نہیں بیٹے! میں تمہیں کبھی اس مکان میں نہیں جانے دوں گا ..... تم کچھ نہیں جانتے بیٹے!"

"میں سب کچھ جانتا ہوں چچا ..... اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔"

اس وقت دروازہ کھلا اور ایک دبلا پتلا نوجوان چھتری تھامے نظر آیا' پھر اس نے چھتری بند کی اور اندر آ گیا' وہ حیرت سے مراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے مراد! اس کا نام ریاست ہے' گاؤں کے سکول کا ہیڈ ماسٹر ہے۔" پھر اس نے مراد کو ایک منٹ ٹھہرنے کا کہا اور بیٹے کو لے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر وہ باہر بارش میں کھڑے باتیں کرتے رہے' تب وہ لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس کے کپڑے اب بھیگ چکے تھے' وہ بڑے عجیب انداز سے مراد کی طرف دیکھ رہا تھا اس نوجوان سے مراد کی کوئی زیادہ جان پہچان نہ تھی' صرف ایک دھندلا سا نقش ذہن میں موجود تھا۔ ریاست بھی اس کے بارے میں شاید اتنا ہی جانتا تھا' وہ مراد کے پاس آ کر بولا۔

"مراد صاحب! ابا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس مکان میں جانے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیں۔"

"کیوں ترک کر دوں؟ کیا تم بھی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرو گے کہ وہاں جنوں کا سایہ ہے۔"

"دیکھئے مراد صاحب!" ریاست ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے میں اس دور دراز گاؤں کا رہنے والا ہوں لیکن میں حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کر کے آیا ہوں، یقین کیجئے میں اس قسم کی لغو باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا لیکن کچھ باتوں کو جھٹلانا ممکن نہیں ہوتا۔ درست ہے کہ کانوں تک غلط باتیں پہنچ سکتی ہیں لیکن آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو نظر آتا ہے۔ میں نے پچھلے کئی دنوں سے جو کچھ اس مکان کے حوالے سے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں آپ کو یہ قدم اٹھانے سے باز رکھوں....."

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" مراد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہنا چاہتا ہوں جناب کہ آپ کی جان جا سکتی ہے۔"

"مجھے جان کی قیمت مت سمجھاؤ نوجوان، میں ایک سپاہی ہوں، موت سے کھیلنا میرا پیشہ ہے، میں بیس سال سے اپنی ماں کی صورت کو ترس رہا ہوں ..... ایک بار وہ پیشانی چومنے کے عوض ہزار بار بھی جان سے گزرنا پڑے تو منظور ہے۔"

وہ تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ ریاست نے اس کا راستہ روک لیا۔

"ہٹ جاؤ آگے سے۔" وہ اسے دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

بوڑھا صحن میں کھڑا تھا۔ اس نے مراد کا بازو تھام لیا۔ "اپنی جوانی پر ترس کھا، یہ کام نہ کر، حضرت سائیں کا حکم ہے....."

"ہٹ جاؤ، میاں جی!" مراد نے اسے پیچھے ہٹایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

بارش اسی طرح جاری تھی۔ اندھیرا اب بہت گہرا ہو گیا تھا۔ وہ گلی میں آیا اور مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک اینٹ پڑی نظر آئی۔ اس نے اینٹ اٹھائی اور تالے کی طرف بڑھا۔ اس کی ٹانگ میں مخصوص ٹیس جاگی، وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا۔ تب گرجدار آواز سنائی دی۔

"کون ہے اوئے، تالا توڑنے والا۔" اندھیرے میں بولنے والے کی شکل صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن اس کا چوڑا چکلا جسم اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی نظر آ رہی تھی۔

"تو کون ہے مجھ سے یہ سوال پوچھنے والا!" مراد نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"میں حضرت سائیں کا مرید ہوں۔ میرے سوا کوئی یہ تالا نہیں کھول سکتا۔" وہ کرخت لہجے میں بولا۔ اندھیرے میں اسے مراد کی وردی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"جا حضرت سائیں سے کہہ دے، ایک تالا کھولنے والا آ گیا ہے۔"

لاٹھی بردار شخص نے آگے بڑھ کر مراد کو دھکا دیا لیکن وہ مضبوطی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کی ٹانگ میں اٹھنے والی ٹیسیں پھر تیز ہو رہی تھیں۔ دھکا لگتے ہی اس کے جسم کا خون جیسے چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔ نو وارد نے آگے بڑھ کر ایک اور دھکا دیا۔ اس دفعہ اس نے کافی قوت صرف کی تھی۔ مراد لڑکھڑا کر ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر اچانک اس پر درندگی سوار ہو گئی۔ اس کا ہاتھ گھوما اور ایک زوردار تھپڑ حملہ آور کے منہ پر پڑا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا، پھر اس نے لاٹھی سونتی اور بجلی کی تیزی سے مراد پر جھپٹا۔ مراد نے جھک کر لاٹھی کا وار بچایا۔ پھر اس کی ٹانگ حملہ آور کے سینے پر پڑی۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کا بھاری بھرکم جسم اچھل کر دو گز دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا مراد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا پھر اس کی ٹانگ مسلسل حرکت کرنے لگی۔ وزنی بوٹ کی ٹھوکروں نے حملہ آور کو رُوئی کی طرح دھنک دیا۔ دھماچوکڑی کی آوازیں سن کر گلی کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ اب چاروں طرف لالٹینیں گردش کر رہی تھیں۔ لوگ بڑی تعداد میں اکٹھے ہو چکے تھے کچھ لوگوں نے حملہ آور اور مراد کے مکالمے بھی سن لئے تھے۔ وہ جانتے تھے یہ اجنبی "حضرت سائیں" کا لگایا ہوا تالا کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ ایک ٹولی آگے بڑھی اور مراد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ حملہ آور موقع غنیمت جان کر اٹھا اور بھاگ گیا۔ ایک شخص جو گاؤں کا کوئی معتبر تھا آگے بڑھ کر بولا۔

"بابو صاحب! آپ کوئی بھی ہیں۔ ہم آپ کو یہ دروازہ نہیں کھولنے دیں گے۔ حضرت سائیں کا حکم ہے۔ اگر یہ دروازہ کھلا تو سارے گاؤں پر مصیبت آئے گی۔ ہم یہ دروازہ نہیں کھولنے دیں گے۔ نہیں کھلنے دیں گے۔" بہت سی آوازیں آئیں۔

"کوئی نہیں روک سکتا مجھے ..... کون روکے گا مجھے ..... یہ میرا گھر ہے ..... میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔" مراد دروازے سے پشت لگا کر دھاڑا۔

"مارو اسے' پتہ نہیں کون ہے۔" مجمعے سے ایک آواز آئی۔ لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

"خبردار!" مراد نے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔

اس وقت ایک جانب سے شور سنائی دیا۔ ایک شخص دو آدمیوں کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اس کے ساتھ چچا طفیل کا بیٹا ریاست بھی تھا۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص گاؤں کا چوہدری ہے اس نے ایک نظر مراد کی طرف دیکھا۔ پھر گاؤں والوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

"بھائیو! یہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں فوج کے اعلیٰ افسر ہیں۔ ہم ان کو زبردستی روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ آپ سب لوگ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

تھوڑی سی کھسر پھسر کے بعد لالٹینیں حرکت میں آئیں اور لوگ منتشر ہونے لگے تین چار آدمی مراد کے پاس آئے۔ ان میں چوہدری' ریاست اور دوسرے معززین شامل تھے' چوہدری نے کہا۔

"کیپٹن صاحب! آپ ہماری بات سننا پسند کریں گے۔"

"دیکھ چوہدری!" مراد اٹل لہجے میں بولا۔ "میں سب سے پہلے اپنی ماں سے ملوں گا' اپنے گھر کو دیکھوں گا۔ پھر تم لوگوں کی باتیں سنوں گا۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ کوئی کچھ نہ بول سکا۔ مراد نے اپنا رخ دروازے کی طرف کیا۔ ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔ ہاتھ سیدھا کر کے تالے کا نشانہ لیا اور

فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور تالا ٹوٹ کر نیچے آ گرا۔

مراد نے مڑ کر دیکھا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں سب لوگ جا چکے تھے۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ یوں لگتا تھا سارا گاؤں ایک دم سو گیا ہے۔ مراد نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ صحن بالکل خالی تھا' وہ اندر داخل ہو گیا' ایک طرف بیری کا درخت تھا' اس کے پتوں پر مسلسل بارش گر رہی تھی' بالکل اچانک مراد کو یاد آیا۔ اس کی ماں کے پاس جو لڑکیاں قرآن مجید پڑھنے آتی تھیں ان میں ایک دبلی پتلی لڑکی تھی' اسے وہ مونگ پھلی کہا کرتا تھا۔ لڑکی کی ماں کہا کرتی تھی لڑکی پر جنوں کا سایہ ہے۔ وہ رات کو بیری کے درخت پر چڑھ جاتی ہے۔ ایک دفعہ وہ اس بیری پر بھی چڑھ گئی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ جنوں کا اثر تھا یا کوئی اور بیماری تھی۔ غیر ارادی طور پر مراد نے بیری کی طرف دیکھا' جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ آج بھی مونگ پھلی بیری پر تو نہیں بیٹھی ہوئی۔ پھر اسے اندازہ ہوا وہ صحن کے وسط میں پہنچ چکا ہے۔ یہاں سے پانچ چھ سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پھر اس نے "ماں" کہنے کے لئے اپنے ہونٹ بند کئے ہی تھے کہ زور سے بجلی چمکی۔ اس نے دیکھا اس کے سامنے صرف تین فٹ کے فاصلے پر ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں عجیب انداز میں کھلی ہوئی تھیں ..... لمحے جیسے ساکت ہو گئے۔ وہ کچھ دیر بغیر پلک جھپکائے اس بے حس و حرکت ہیولے کو دیکھتا رہا جو اس کی ماں کا پیکر تھا۔ پھر دھیمے قدموں سے آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اب وہ ایک بچے کی طرح ماں کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا لیکن اسے اٹھانے کے لئے "دو ہاتھ" اس کے شانوں تک نہیں آئے۔ ماں کا پیکر بے حس و حرکت تھا۔ زندگی یا احساس کی کوئی رمق اس میں نظر نہیں آتی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ جھنکار کی آواز آئی یہ ایک زنجیر تھی۔ اس کا ایک سرا دروازے اور دوسرا اس کی ماں کی گلائی سے منسلک تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے چنگاریاں بھر گئیں اس کا ہاتھ ایک بار پھر اپنے پستول کی طرف گیا لیکن اس وقت دیئے کی مدھم روشنی میں کمرے کی عقبی دیوار پر

کوئی چیز لٹکی نظر آئی۔ یہ ایک چابی تھی۔ اس نے چابی اتاری اور ماں کے ہاتھوں میں لگی ہوئی زنگ آلود ہتھکڑی کھول دی۔ کلائی پر ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑی محبت سے ماں کی زخمی کلائی کو بوسے دینے لگا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے پھر اس نے ایک ہاتھ سے ماں کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ نظروں سے اس چہرے کا طواف کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ماں میں تیرا کھویا ہوا بیٹا مراد ہوں۔"

عورت یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ اسے کندھوں سے تھام کر ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لے آیا تب اس نے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ چارپائی کے علاوہ کمرے میں ایک بوسیدہ پھٹا ہوا کھیس پڑا تھا۔ دروازے کے قریب ایک مٹی کا گھڑا رکھا تھا' فرش پر ایک تھالی پڑی تھی۔ طاق میں ٹمٹماتا ہوا دیا اور کونے میں لکڑی کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا جو شاید کسی کلہاڑی کا دستہ رہا ہو گا۔ ماں کی قیام گاہ کا منظر دیکھ کر مراد کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ ماں کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

"ماں مجھے دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں۔" یہ فقرہ ایک تمہید تھا اور پھر.....

بیس سال سے دل کے پنجرے میں قید باتوں کے پنچھی آزاد ہونے لگے' پر کھولنے لگے' پھڑپھڑانے لگے۔ وہ آنسوؤں کے درمیان بولتا رہا..... بولتا رہا' ماں کو بتاتا رہا کہ وہ اس کا بیٹا ہے' وہ اس کی ماں ہے اور ماں سنتی رہی۔ سکتے کے عالم میں ایک انجان عورت کی طرح اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ زندگی کی واحد نشانی اس کی آنکھوں میں پانی کی چمک تھی لیکن شاید یہ بھی مراد کا وہم تھا۔ ہاں وہ بالکل انجان تھی' بالکل بے حس اور پھر مراد نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور تب جیسے اس نے ہوش میں آ کر اپنی آزاد کلائی کی طرف دیکھا اور اس کے جسم میں زندگی کی حرکت پیدا ہوئی لیکن یہ حرکت مراد کے لئے قیامت بن گئی۔ عورت نے اچانک لپک کر کونے میں پڑا ہوا لکڑی کا ڈنڈا اٹھا لیا۔ پھر وہ بھوکی شیرنی کی طرح مراد پر جھپٹی اور اسے پیٹنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی' چلے جاؤ یہاں سے ..... دفع ہو جاؤ ..... میں کچھ نہیں جانتی مجھے کچھ معلوم

نہیں' کون ہو تم ..... چلے جاؤ۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ مراد لکڑی کے وار اپنے ہاتھوں پر روک رہا تھا' کبھی کبھی کوئی اچٹتی ہوئی ضرب اس کے سر یا کندھے پر بھی پڑ جاتی تھی۔ اسے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں شدید درد محسوس ہو رہی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ ڈنڈے کے سامنے ضرور کر رہا تھا لیکن اس نے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔ "ماں ..... ماں میری بات تو سنو ....." وہ بار بار یہ الفاظ دوہرا رہا تھا اور پھر دفعتاً لکڑی کا ڈنڈا اس کے مضبوط شانے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ عورت نے لکڑی کا ٹکڑا گھما کر دیوار پر دے مارا۔ پھر اسے خالی ہاتھوں سے دھکے دینے لگی۔ بالآخر مراد نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کلائی کا زخم نہ دکھے نہ ہی اس نے اتنا زور لگایا کہ ماں کو بازو ہلانے میں دقت ہو۔

"ماں' جب تک میری بات نہیں سنو گی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ مجھ پر ایسی دس لکڑیاں بھی توڑ دو گی تو نہیں جاؤں گا۔ میری بات سنو ماں!"

عورت نے اپنی کلائیاں چھڑائیں اور بے دم ہو کر چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور رونے لگی۔ مراد اس آواز کو پہچانتا تھا' ابھی تھوڑی دیر پہلے چچا طفیل کے گھر اس نے یہی آواز سنی تھی' تھوڑی سی دیر میں اس نے اپنی ماں کو دوسری بار روتے ہوئے سنا تھا' اس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ "ماں ..... ماں۔" وہ اس کے قریب کھڑا پکارتا رہا اور وہ روتی رہی' پھر وہ اپنا کلیجہ تھام کر اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی پھر کھڑکی کی طرف لپکی ..... کھڑکی کے پٹ بند کئے اور پلٹ کر مراد کی طرف دیکھنے لگی' اس کی آنکھوں کا پانی لرزا' اس کے نتھنے پھڑپھڑائے' بازو وا ہوئے اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپک کر مراد کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

بند ٹوٹ گئے' آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا ..... "بچے ..... میرے بچے!" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور اس کی گردن کے زیریں حصے پر بوسے دے رہی تھی۔ مسرت و انبساط کے ان لمحوں میں مراد کو یاد آیا کہ اس کی گردن پر اس جگہ ایک سانولا سا

داغ تھا جیسے کسی چیز کا دھبہ ہو' یقیناً اس کی ماں اس دھبے کو پیار کر رہی تھی۔

بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا' دیئے کی روشنی میں ماں بیٹا آمنے سامنے بیٹھے تھے' مراد دیکھ رہا تھا ماں کی آنکھوں میں ممتا کے سمندر موجزن ہیں ..... لیکن وہ بہت جلدی میں دکھائی دیتی تھی۔ مراد کو اس کمرے میں داخل ہوئے صرف آدھ گھنٹہ ہوا تھا لیکن بیس سال بعد کی یہ ملاقات اختتام پذیر ہوتی نظر آ رہی تھی۔ عورت نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور اس کی پیشانی پر لگا تار کئی بوسے دینے کے بعد گلوگیر آواز میں بولی۔

"میرے مراد! بیس سال تیرے ملنے کی دعا کرتی رہی ہوں لیکن ..... آج تو ایسے وقت ملا ہے ..... کہ سوچتی ہوں کتنا اچھا ہوتا تو نہ ملتا۔"

مراد نے کہا۔ "ماں! حوصلہ رکھو' میں تمہاری سب باتیں سنوں گا اور اپنی تمام باتیں سناؤں گا ..... پہلے مجھے اس گھر کے اندھیرے کمروں میں روشنی کر لینے دو....."

"نہیں میرے پُتر نہیں۔" عورت تڑپ کر بولی۔ "ان کمروں میں اندھیرا ہی رہنے دو۔" پھر اس نے آنسو روک کر مراد کا چہرہ اپنے سامنے کیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پتر' اتنی دیر بعد ملے ہو تو اپنی ماں کو دکھی نہ کرنا' کوئی سوال پوچھے بغیر اس کی بات مان لینا ..... یہاں سے چلے جاؤ پُتر!..... فوراً چلے جاؤ..... پھر کبھی واپس نہ آنا ..... اگر میری قسمت میں ہوا تو تمہاری صورت دیکھ لوں گی۔ ورنہ سمجھوں گی کہ تم کبھی ملے ہی نہیں ..... چلے جاؤ پتر....."

مراد نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور محبت سے بولا۔ "ماں! تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟"

مراد نے دیکھا ماں جواب دینے کی بجائے اپنے سائے کو گھور رہی ہے' اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی دہشت نظر آ رہی تھی۔ "مجھے کسی کا ڈر نہیں پُتر۔" آخر وہ تھوک نگل کر بولی۔ "دراصل مجھ پر ..... مجھ پر ہوائی چیزوں کا سایہ ہے۔ مجھے دورے

پڑتے ہیں ..... میں بیمار ہوں' اگر تو یہاں میرے ساتھ رہا تو تو بھی ..... یہاں سے چلا جا پتر' میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔"

مراد نے دیکھا ماں کا چہرہ تاریک ہوتا جا رہا ہے اور ہاتھ پاؤں عجیب سے انداز میں اینٹھنے لگے ہیں۔ وہ یک ٹک کھڑکی پر پڑنے والے اپنے سائے کو دیکھ رہی تھی ..... اور پھر مراد نے دیکھا کہ کھڑکی آہستہ آہستہ ہل رہی ہے۔ اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی ..... "وہ آ رہے ہیں ..... وہ آ رہے ہیں۔" اس کی ماں کے منہ سے نکلا ..... مراد نے دیکھا اس کا چہرہ خوف کی زیادتی سے بگڑ گیا تھا' آنکھیں الٹ گئی تھیں اور پتلیوں کے سفید حصے نظر آ رہے تھے۔

"ماں تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔

وہ اب اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا رہی تھی جیسے کسی چیز سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے منہ سے ناقابلِ فہم آوازیں نکل رہی تھیں ..... پھر وہ دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھی اور چیختی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ اس سے پہلے کہ مراد اسے پکڑتا وہ بند دروازے کے تختوں سے ٹکرائی اور ایک چیخ کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گئی' کمرہ ایک بار پھر گہری خاموشی میں ڈوب گیا' دیئے کی روشنی دیواروں پر عجیب سائے بنا رہی تھی۔ مراد کا سر چکرانے لگا اس کے کانوں میں چچا طفیل کے بیٹے کے الفاظ گونج رہے تھے ..... "میں کہنا چاہتا ہوں جناب کہ اس مکان میں آپ کی جان جا سکتی ہے۔" مراد کو محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں دھند سی بھر رہی ہے۔ "بھوت پریت آسیب نفسیات سائنس سب کچھ اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کیا واقعی؟....."

"نہیں ....." اس کا ذہن چیخ اٹھا' یہ سب اس کا وہم ہے۔ وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "اٹین شین!" اس نے خود کو حکم دیا۔ اس نے دو تین گہرے سانس لئے' ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا' خود فراموشی کی لمحاتی کیفیت گزر چکی تھی' اب ایک بار پھر وہ آہنی اعصاب کا مالک سپاہی نظر آ رہا تھا' اس نے ہاتھ بڑھایا اور ایک جھٹکے سے کھڑکی کھول دی' ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں

در آئے' باہر بارش تھم چکی تھی اور تیز ہوا بادلوں کے پردے ہٹا کر ستاروں کے چہرے بے نقاب کر رہی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا' کھڑکی صرف ہوا سے ہل رہی تھی۔ مراد نے کمرے کا دروازہ کھولا گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی لیا اور بے ہوش ماں کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا' چند لمحوں بعد اس کے پپوٹوں میں جنبش ہوئی۔ "پانی' پانی۔" اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی' اس نے چلو سے ماں کو پانی پلایا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا' تناؤ کم ہو چکا تھا۔ خدوخال پھر اصل حالت میں واپس آ رہے تھے۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی' فاختائی رنگ بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھول رہی تھی ..... کتنا تقدس تھا' کیا خوبصورتی تھی' وہ ماں کی من موہنی صورت دیکھتا رہا اور پھر ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی پر پہنچ کر اس نے دیکھا' چچا طفیل کے گھر کا برآمدہ دکھائی دے رہا تھا' گھر ایک سہمی ہوئی خاموشی میں لپٹا ہوا تھا' گلی بلکہ پورے گاؤں پر یہی سہمی ہوئی خاموشی طاری تھی' صرف مینڈکوں کی آوازیں تھیں جو بارش بند ہونے کے بعد مسلسل ٹرا رہے تھے' چاند نکل آیا تھا اور اس کی مدھم روشنی بھیگے در و دیوار پر چمک رہی تھی اور تب مراد کو گلی میں ایک سایہ نظر آیا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیپٹن صاحب! ماں جی تو خیریت سے ہیں؟" سائے نے پوچھا۔ یہ ریاست تھا۔

"ہاں ریاست' سب ٹھیک ہے' کیا تم ایک چارپائی اور دو لالٹینوں کا انتظام کر سکتے ہو!"

"ابھی لیجئے۔" سائے نے کہا اور تیزی سے ایک طرف غائب ہو گیا۔

مراد کھڑکی سے ہٹ کر کمرے کی طرف گھوما اور تب اسے احساس ہوا کہ اس سے کوئی چیز "مس" ہوئی ہے۔ آنکھوں کو کسی تشنگی کا احساس ہوا۔ وہ ایک بار پھر اس کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور تب اس کی نگاہیں کچے مکانوں کے نشیب و فراز سے ٹکرائیں' خود بخود ایک جگہ آ کر رک گئیں' گلی کے دوسری طرف یہ ایک گھر کا صحن تھا' سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے میں دو دروازے نظر آ رہے تھے' وہ اس جگہ کو اچھی طرح جانتا تھا' کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا لیکن اگر کچھ بدلا بھی تھا تو چاند کی مدھم روشنی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہ مسرت کا گھر تھا' شوخ آنکھوں اور بے انتہا خوبصورت ہونٹوں والی مسرت کا گھر' ہاں لیا وہ اب بھی اس گھر میں رہتی تھی' اس کے سینے میں جلن سی اتر گئی' اس کی آنکھیں کچھ دیر اس منظر پر ساکت رہنا چاہتی تھیں لیکن وہ انہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی ماں کمرے میں بے ہوش پڑی تھی اس کا گھر تاریک تھا ..... کمروں کے دروازے بند تھے اسے آج رات بہت کچھ کرنا تھا ..... کھڑکیوں اور دروازوں کو کھولنا تھا' تالے توڑنے تھے' زنجیریں کاٹنی تھیں' کمروں میں روشنی بکھیرنی تھی' اسے اس تاریک اور اداس گھر کو گاؤں کا سب سے روشن گھر بنانا تھا.....!!

☆==========☆==========☆

جیپ گرد اُڑاتی گلو شاہ کے مزار کے سامنے جا رکی۔ چاق و چوبند باوردی ڈرائیور نے جلدی سے نیچے اتر کر مراد کی طرف کا دروازہ کھولا جونہی مراد نیچے اترا' دو باریش افراد آگے بڑھے اور بڑے ادب سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"پیر صاحب موجود ہیں؟" مراد نے کسی قدر تلخ اور بھاری آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔" ایک شخص نے لکڑی کے سبز دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ مراد ان کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہوا' سامنے اینٹوں کا بنا ہوا وسیع صحن تھا' آخر میں دو کمرے نظر آ رہے تھے' مراد نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور نوجوان لڑکی صحن کے بیچوں بیچ بیٹھی ہیں۔ ادھیڑ عمر عورت اپنی چادر سے اور لڑکی اپنے لمبے لمبے بالوں سے صحن کا فرش صاف کر رہی تھی۔ مراد نے اس منظر کو قدرے حیرت سے دیکھا اور ایک کمرے کے سامنے پہنچا' دروازے پر بہت سے جوتے پڑے تھے' مراد ایک لمحے کے لئے رکا پھر جوتوں سمیت اندر داخل ہو گیا' آخر کو یہ گھر تھا کوئی مسجد تو نہیں تھی' یہ ایک وسیع کمرہ تھا فرش پر دریاں بچھی ہوئی تھیں' کوئی تیس افراد کمرے میں موجود تھے' ان میں بچے بوڑھے سب شامل تھے' عورتیں پچھلی قطار میں بیٹھی تھیں۔ سب نے بڑے احترام سے سر جھکا رکھے تھے اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک شخص گاؤ تکیے سے ٹیکے بیٹھا تھا' اس نے گہرے زرد رنگ کا ایک چمکدار چولا پہن رکھا تھا اور اسی رنگ

کی ایک چادر سر پر اوڑھ رکھی تھی' چہرہ مکمل طور پر چادر میں چھپا ہوا تھا' پورے کمرے میں اگربتیوں کا خوشبودار دھواں بھرا ہوا تھا' مراد کے اندر داخل ہونے کی آہٹ سن کر کسی نے سر نہیں اٹھایا' وہ نپے تلے قدموں سے چلتا زرد چادر والے شخص کے عین سامنے جا پہنچا' اگر وہ غلطی نہیں کر رہا تھا تو یہی وہ پیر تھا جس نے اس کی ماں کو قید تنہائی کی سزا دے رکھی تھی۔ غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کے ہونٹ خود بخود متحرک ہو گئے۔

"پیر صاحب! میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا لہجہ اگلے چند لمحوں میں زبردست گستاخانہ انداز اختیار کرنے والا ہے۔

تھوڑے انتظار کے بعد گہرے زرد رنگ کی چادر میں حرکت پیدا ہوئی اور پیر صاحب کا سر آہستہ آہستہ بلند ہوا۔ تب مراد نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک نہایت سرخ و سپید اور بارعب چہرہ دیکھا' سر اور داڑھی کے بال بالکل سیاہ تھے لیکن ان کی روپہلی جڑیں بتا رہی تھیں کہ کلف استعمال کیا گیا ہے۔ چہرے سے عمر کا اندازہ کرنا خاصا دشوار تھا' اس چہرے کی سب سے نمایاں بات آنکھیں تھیں' یہ آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور ان میں ایک بے نام سی کشش تھی' مراد کو محسوس ہوا کہ جیسے کسی نادیدہ ہاتھ کی انگلیاں اس کے سر کے اندر رینگنے لگی ہوں' اس نے اپنی زندگی میں کسی شخص کی آنکھیں اتنی بڑی نہیں دیکھی تھیں' وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آنکھیں انچ کا دسواں حصہ بھی اور بڑی ہوتیں تو شاید یہ بارعب چہرہ ایک خوفناک روپ اختیار کر جاتا۔ اس سے پہلے کہ مراد کچھ بولتا' زرد چولے کے اندر سے پیر صاحب کا ہاتھ بلند ہوا' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے' مراد نے غیر ارادی طور پر بیٹھنے کے لئے حرکت کی لیکن پھر جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔ غصے کا جوالا پھر دہکنے لگا اور وہ تیز لہجے میں بولا۔ "میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔" بڑی بڑی سرخی مائل آنکھیں چند لمحے اس کی پیشانی پر جمی رہیں پھر پیر صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے' ایک مرید نے جلدی سے آگے بڑھ کر بغلی دروازہ کھول دیا۔ مراد پیر صاحب کے پیچھے چلتا اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ حیران کن بات تھی کہ اس

وقت میں حاضرین محفل میں سے نہ کسی نے سر اٹھایا اور نہ بات کی' مراد کے اندر داخل ہوتے ہی اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا.....!

"میرا نام مراد ہے....." مراد نے اتنا ہی کہا تھا کہ پیر صاحب نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں سب جانتا ہوں بیٹا! سب جانتا ہوں۔" ایک ٹھہری ہوئی پرسکون آواز کمرے میں گونجی۔ "مجھے معلوم ہے شفیع محمد کے چھوٹے بیٹے مراد کی رات کہاں گزری ہے۔"

مراد کے سینے میں بھڑکی ہوئی آگ کی تپش اس کے لہجے میں داخل ہو رہی تھی وہ بولا۔ "تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ میری رات کہاں گزری ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ کیسے گزری ہے..... ایک پہاڑ کاٹا ہے میں نے رات بھر..... رات بھر میں نے اپنی ماں کے زخم کاٹے ہیں' پیر صاحب....." زرد آستین والا ہاتھ بلند ہوا' پیر سائیں کی گمبھیر آواز نے اس کی بات کاٹی۔

"حوصلہ میرے بچے..... حوصلہ' جلدی میں سب کام خراب ہو جاتے ہیں۔"

پیر صاحب ایک الماری تک پہنچے اور اس پر لٹکتا ہوا پردہ کھینچ دیا۔ "ان چیزوں کو پہچانتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

مراد دو قدم چل کر آگے آیا اور حیرت سے الماری میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' یہ کیسے ہوا؟ اس کا ذہن چیخ اٹھا' مورچوں کی لحد ہی سے برآمد ہونے والی تمام اشیاء اس کے سامنے رکھی تھیں..... لیکن یہ چیزیں تو وہ لیفٹیننٹ ادریس کی تحویل میں دے کر آیا تھا اور اسے سختی سے ان کی حفاظت کرنے کو کہا تھا۔

"یہ صندوق اور ڈبے یہاں کیسے؟" مراد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس لئے بیٹا کہ میں جانتا تھا یہ چیزیں تمہارے لئے کس قدر ضروری ہیں۔ ان چیزوں کی بدولت ایک روز تمہاری ماں کی ذہنی حالت ٹھیک ہو جائے گی..... اس کے جسم اور اس کی روح پر چھائے ہوئے شیطانی سائے چھٹ جائیں گے..... یہ چیزیں

تمہارے لئے بہت قیمتی ہیں اور تمہاری لاپرواہی کی وجہ سے یہ چھن رہی تھیں' اگر میں توجہ نہ دیتا تو یہ اتنی دور چلی جاتیں کہ کوئی انہیں واپس نہ لا سکتا' اچھی طرح دیکھ لو کوئی شے کم تو نہیں ..... لیکن مجھ سے یہ نہیں پوچھنا کہ یہ چیزیں یہاں کیسے پہنچیں' اور نہ ہی اپنے ماتحتوں کو برا بھلا کہنا۔"

مراد نے آگے بڑھ کر دیکھا آہنی صندوق میں بوسیدہ کپڑے' سرخ ڈبوں میں اس کی ماں کے زیور اور گول ڈبے میں سوئیاں' بٹن اور مڑے تڑے نوٹ' سب کچھ موجود تھا' اس نے پھر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا لیکن پیر سائیں کی آواز آئی۔

"بیٹا! تمہاری ماں کے لئے میں نے وہی کچھ کیا جو اس کے حق میں بہتر سمجھا اور تم بھی جلدی سمجھ جاؤ گے' اس کے ہاتھ میں لگی ہوئی ہتھکڑی دراصل اس کی زندگی کی ڈور تھی' تمہارے گھر کو لگا ہوا تالہ دراصل اس کی جان کا محافظ ہے۔ تم نے یہ دونوں چیزیں توڑی ہیں' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں پھر ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔"

پیر سائیں کے لہجے میں عجیب طرح کی متانت تھی۔ وہ عام دیہاتی شعبدے باز پیروں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ مراد نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

پیر سائیں نے اپنی سوئی سوئی آنکھیں مراد کی پیشانی پر جمائیں اور بولا۔ "اگر میں کچھ کہوں گا تو تو بحث کرے گا ..... میں ایک فقیر آدمی ہوں' زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ کائنات ایک سمندر ہے اور ہمارا علم ایک قطرہ' بے شمار سوال ایسے ہیں جن کا جواب آج کے بڑے بڑے سائنس دانوں کے پاس بھی نہیں ..... اور میرے بیٹے ایسا ہی ایک سوال میں تمہارے گھر کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں' یہ سوال مجھے مجبور کرتا ہے کہ تمہیں احتیاط سے رہنے کا مشورہ دوں۔"

اچانک مراد کے ذہن میں اپنی ماں پر لگائے جانے والے شرمناک الزام کا خیال آیا اور اس کا ذہن پھر کھول اٹھا لیکن اس وقت پیر سائیں نے بڑی ملائمت سے اپنا ہاتھ اس

کے کندھے پر رکھ دیا۔

"بیٹے! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ..... بہت ٹھنڈے دل سے ..... بہت ٹھنڈے دل سے....."

پیر سائیں کا ہاتھ آہستہ آہستہ اس کے کندھے کو سہلا رہا تھا اور اس کے سینے میں عجیب طرح کی خنکی اترتی جا رہی تھی' تنی ہوئی رگیں ڈھیلی ہو رہی تھیں' اس نے ایک بار پھر حواس کو مجتمع کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیر صاحب سے آنکھیں چار کرتا ایک مرید سر جھکائے اور نظریں زمین میں گاڑے اندر داخل ہوا۔

"حضرت پیر سائیں! ایک "کسر" والا بچہ ہے۔" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

پیر صاحب تیز قدموں سے باہر نکل گئے' مراد بھی باہر آ گیا' بڑے کمرے میں تمام افراد اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے' مسند کے سامنے چٹائی پر ایک ڈیڑھ سالہ بچہ لیٹا تھا' اس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے' رنگ نیلا ہو رہا تھا اور گردن عجیب انداز میں پیچھے کی طرف کھنچی ہوئی تھی' بچے کے والدین سر جھکائے اس کے پاس بیٹھے تھے' نوجوان عورت نے سسکیاں روکنے کے لئے دوپٹہ منہ میں دبا رکھا تھا۔ مرد جو حلیے سے غریب کاشت کار نظر آ رہا تھا۔ بار بار اسے دلاسہ دے رہا تھا' بچے کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہو رہی تھی' آخر عورت سے ضبط نہ ہو سکا وہ چیخ کر بولی۔ "حضرت سائیں یہ آپ ہی کی دین ہے اب آپ ہی اسے بچائیں۔"

عورت کی آواز سن کر مجمعے میں سراسیمگی پھیل گئی ایک مرید آگے بڑھا اور اس نے جلدی سے عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر دو آدمی اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے' لگتا تھا پیر سائیں کی موجودگی میں بلند آواز سے بولنا نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے' پیر صاحب کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بچے کے ننگے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے' یہ عمل طویل ہوتا چلا گیا' مراد کھڑا دیکھتا رہا' پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ پیر صاحب کے متحرک ہونٹ ساکت ہو گئے ہیں' اس نے جلدی سے بچے کی طرف دیکھا اور اس کی تیز نگاہوں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ بچہ مر گیا ہے۔

چند لمحے بعد جب وہ اپنی جیپ میں مزار گلو شاہ سے روانہ ہو رہا تھا' سبز دروازے سے باہر ایک ماں اپنے بچے کی لاش سینے سے لگائے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

آج پھر وہی ٹیس ٹانگ میں جاگی تھی' شاید کوئی انہونی ہونے والی تھی۔ مراد کو اپنے گاؤں میں آئے چار روز ہو چکے تھے' گاؤں کے نواح میں فوجی مشقیں ختم ہو چکی تھیں' تمام یونٹ واپس جا چکے تھے لیکن کیپٹن مراد کی جی ایچ کیو کو صرف ایک درخواست پہنچی تھی۔ اس نے دو ماہ کی رخصت لے لی تھی۔ صندوق اور دوسری چیزوں کی پیر صاحب کے حجرے میں منتقلی کا معمہ حل نہیں ہو سکا تھا' کیمپ میں جس چھولداری کے اندر یہ چیزیں رکھی گئی تھیں اس کو عقب سے کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا تھا اور نامعلوم افراد کے قدموں کے نشان ملے تھے۔ مجرموں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی کہ فوجی کیمپ سے چیزیں لے اُڑے تھے۔ پیر صاحب نے تو یہی تاثر دیا تھا کہ جیسے کچھ اور لوگ یہ چیزیں چرانا چاہتے تھے لیکن ان کی مداخلت سے کامیاب نہ ہو سکے۔

مراد فی الوقت کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' بہرحال اس کے لئے یہی بات اہم تھی کہ تمام اشیاء جوں کی توں موجود تھیں اور اب اس کے گھر میں محفوظ پڑی تھیں' ان تینوں دنوں میں گھر کے اندر اور باہر کوئی غیر معمولی واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ ماں بدستور علیل تھی' مراد نے ریاست کے ہاتھ نزدیکی قصبے سے ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو بلوایا تھا' اس نے تفصیلی معائینے کے بعد دوائیاں وغیرہ دی تھیں' ابھی ماں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ مراد اس سے کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو کرتا۔ وہ پیر سائیں سے دوبارہ ملاقات کا خواہشمند تھا لیکن کسی بھی پیش قدمی سے پہلے اسے ماں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

☆==========☆==========☆

آج شام بڑی سہانی تھی' دو دن وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی لیکن آج دوپہر آسمان صاف ہو گیا تھا۔ ہر چیز نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی' مراد "اونچے" کمرے کی کھڑکی میں کھڑا بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔

یہ مسرت کا گھر تھا۔ صحن میں دو تین مرتبہ ایک بوڑھی عورت گھومتی پھرتی نظر

آئی' یہ شاید مسرت کی ماں تھی' لیکن مراد کے گھر آنا تو درکنار اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی جانب نہیں دیکھا تھا اور یہ رویہ کوئی اس عورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا' سارا گاؤں اس سے کنی کترا رہا تھا' لوگ اس گھر کے ساتھ ساتھ مراد سے بھی خوفزدہ نظر آتے تھے لیکن اس کھچاؤ میں کسی طرح کی نفرت کو دخل نہیں تھا۔ صرف ایک ڈر تھا جو ہر شخص کی نگاہوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ مراد نے غور سے دیکھا برآمدے سے آگے کمرے کے دروازے پر جھولتے پردے کے پیچھے پھر ایک مدھم شبیہہ ابھر رہی تھی' مراد کل بھی کتنی دیر اس پردے کو دیکھتا رہا تھا۔ کبھی تو واقعی اسے لگتا کہ پردے کے پیچھے کوئی موجود ہے جو اسے دیکھ رہا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگتا۔ آج بھی اس نے اسی دھندلے سے منظر کے لئے کھڑکی کھولی تھی' پہلے پردہ بالکل صاف تھا لیکن اب اس کے عقب میں مدھم رنگ نظر آ رہے تھے ..... کیا اس کے پیچھے مسرت تھی؟ وہ کتنی ہی دیر دھڑکتے دل کے ساتھ سوچتا رہا۔ اگر وہ اس گھر میں تھی تو پھر یقیناً اس کی آمد سے آگاہ ہو چکی ہو گی لیکن کیا اس کے ذہن میں بچپن کے نقش سلامت تھے؟ وہ کتنی ہی دیر پردہ اٹھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن کچھ نہ ہوا۔ صرف بوڑھی عورت صحن میں جمع ہونے والے پانی کو جھاڑو سے کھینچ رہی تھی۔ وہ مایوس ہو کر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل بچوں جیسی حرکات کر رہا ہے وہ کرسی پر بیٹھ گیا..... سامنے میز پر وہی لفافہ پڑا تھا جو اس کی خالہ نے بھیجا تھا اور جس میں ایک لڑکی کی تصویر تھی' اس نے بے خیالی میں تصویر اٹھالی اور خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا' غیر ارادی طور پر وہ بار بار کرسی سے تھوڑا سا اٹھتا اور کھڑکی سے باہر جھانک لیتا ..... پھر ایک بار وہ اٹھا تو دوبارہ نہ بیٹھ سکا' آنکھیں ساکت ہو کر رہ گئیں' دروازے پر جھولتا ہوا پردہ اٹھا تھا اور ایک سرو قد خوبصورت لڑکی بال صحن میں نظر آئی تھی۔ اس کے دھلے ہوئے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ گیلے کپڑے صحن میں تنی ہوئی رسی پر پھیلا رہی تھی' مراد چونکہ کمرے کی تاریکی میں تھا اس لئے کھڑکی خالی نظر آ رہی تھی' لڑکی نے ایک اچٹتی سی نگاہ کھڑکی پر ڈالی۔ مراد کی تمام حسیں جیسے آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ دل سے ایک صدا سی

نکل رہی تھی۔ "مسرت ..... مسرت ہاں یہ وہی ہے ..... یہ خوبصورت ہونٹ ..... یہ نایاب ہونٹ کسی اور کے ہو ہی نہیں سکتے تھے ..... یہ لاثانی ہونٹ جس کے بھی تھے وہ مسرت تھی ..... صرف مسرت ....." وہ تیزی سے کھڑکی میں آیا ..... لڑکی نے جھک کر بالٹی میں سے ایک کپڑا اٹھایا' اسے دونوں ہاتھوں کے زور سے نچوڑا۔ ہوا میں جھٹکا ..... اور اس وقت اس کی نگاہ مراد پر پڑی۔ لمحے ساکت ہو گئے' گردش تھم گئی' مراد کو محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف دو آنکھیں رہ گئی ہیں' سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان آنکھوں نے اسے بتا دیا کہ وہ اسے پہچانتی ہیں' اسے سوچتی رہی ہیں ..... اسے دیکھتی رہی ہیں' پھر سیکنڈ کا وہ انمول حصہ گزر گیا' وہ آنکھیں جھینپ گئیں چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے' لڑکی نے ایک نظر گھوم کر بوڑھی عورت کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ میں پکڑا پھولدار ریشمی کرتہ رسی پر پھیلا دیا۔ اب اس کا چہرہ کرتے کے پیچھے چھپ چکا تھا پھر اس کے ہاتھ دکھائی دیئے وہ بالٹی میں سے ایک اور کپڑا نکال رہی تھی' پہلے کی طرح اس نے کپڑے کو نچوڑا' ہوا میں جھٹکا' ایک اچٹتی نظر مراد پر ڈالی اور کپڑا رسی پر پھیلا دیا' یہ ایک دو تین سالہ بچے کی قمیض تھی ..... مراد کے دل پر گھونسہ سا لگا' اس نے دیکھا لڑکی خالی بالٹی اٹھائے واپس جا رہی ہے۔ ایکا ایکی اس کا جسم نقاہت سے بھر گیا۔

وہ کمر پر ہاتھ باندھے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا قریب ہی اس کی والدہ خواب آور دوائی کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہی تھی' وہ ابھی ابھی انہیں دوائیاں کھلا کر فارغ ہوا تھا۔ اس نے احتیاط سے ماں کی ٹانگوں پر چادر پھیلائی اور دیوار پر لٹکتی ہوئی لالٹین کی لَو مزید کم کر دی۔ کل اور پرسوں وہ ریوالور تکئے کے نیچے رکھ کر سویا تھا لیکن آج وہ لالٹین کے ساتھ ہی دیوار پر لٹک رہا تھا' وہ مسہری پر آ کر بیٹھ گیا' ذہن رسی پر لٹکتی ہوئی قمیض میں اٹکا ہوا تھا' تو کیا مسرت شادی شدہ تھی اور رہنے کے لئے میکے آئی ہوئی تھی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قمیض کسی اور کے بچے کی ہو' مثلاً ہمسائی کے بچے کی' اگر یہ بچہ مسرت کا تھا تو ایک آدھ بار تو صحن میں نظر آتا۔ یہ بچہ مسرت کا بھائی ..... لیکن یہ خیال وہ پہلے ہی رد کر چکا تھا' مسرت کا بھائی اتنا کم عمر نہیں ہو سکتا' معلومات کا واحد

ذریعہ ریاست تھا اس نے سوچا صبح اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرے گا' دو راتوں کے قیام کے بعد گھر کے در و دیوار سے لپٹے ہوئے خوف کے سائے معدوم ہوتے دکھائی دے رہے تھے' اس نے حسبِ معمول آیت الکرسی پڑھ کر پہلے والدہ کی چارپائی کی جانب پھونک ماری اور پھر اپنے سینے پر پھونک کر آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ جب اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک عجیب منظر دیکھا اس کی والدہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھی کمرے کی بند کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی حد تک کھلی ہوئی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی ..... "ماں ..... ماں کیا بات ہے؟" مراد نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں سے مراد کی طرف دیکھتی رہی' پھر خاموشی سے بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاید سوتے میں ڈر گئی تھی' مراد نے سوچا اور چادر پھر ٹھیک کر کے اس کی ٹانگوں پر پھیلا دی' تھوڑی دیر جاگنے کے بعد وہ بھی سو گیا۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی' چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی' شاید لالٹین کا تیل ختم ہو گیا تھا' اس نے ایک دو بار آنکھیں جھپکیں اور اردگرد کا ماحول واضح ہونے لگا ..... اسے اپنے چہرے کے سامنے تقریباً چار فٹ کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ نظر آئی۔ کمرے میں یہ شاخ کہاں سے آئی۔ اس نے سوچا اور پھر اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا ..... وہ کمرے میں نہیں تھا' اس کے چاروں طرف درخت تھے اور وہ جھینگروں کی آواز اپنے بالکل قریب سن رہا تھا' اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم کو حرکت دینے میں ناکام رہا اور اس وقت اس پر یہ انتہائی لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ وہ ایک قبرستان میں لیٹا ہوا ہے' کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا اور خون کا نمکین ذائقہ زبان پر پھیل گیا' اس نے ایک بار پھر اٹھنا چاہا لیکن جسم جیسے مفلوج ہو چکا تھا' تب اس نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے داہنے کندھے کے قریب لکڑی کا ایک جنگلہ سا دیکھا۔ وہ کس چیز پر لیٹا ہوا تھا؟ ایک کربناک چیخ اس کے سینے سے بلند ہوئی اور حلق میں اٹک گئی۔ یہ جنازے کا پلنگ تھا جو سنسان قبرستان کے بیچوں بیچ

پڑا تھا' چاروں طرف چھوٹی بڑی قبریں تھیں ..... جنتر کی جھاڑیاں تھیں اور تاریکی تھی ایک لمحے کے لئے مراد کے ذہن میں آیا کہ شاید وہ مرچکا ہے' شاید اسے دفنانے والوں نے کوئی ڈراؤنا منظر دیکھا ہے اور اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اس نے حلق میں اٹکی ہوئی چیخ کو آزاد کیا۔ "کوئی ہے؟" یہ آواز سناٹے کے دوش پر تیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی' کسی قریبی درخت سے ایک الو پھڑپھڑا کر اڑا اور شہرِ خموشاں پھر خاموش ہو گیا .....

مراد کے نتھنوں میں ایک عجیب طرح کی بو گھس رہی تھی' جب اس نے اس بو کو پہچانا تو سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ ایسی خوشبو اس نے قبرستانوں میں سونگھی تھی' جنازوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے چارپائی پر ایک سیاہ رنگ کا کپڑا پڑا ہوا ہوتا ہے جس پر قرآنی آیات لکھی ہوتی ہیں۔ اس کپڑے پر گلاب کے پھول بکھرے میت کو کندھا دیتے ہوئے اور قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے' یہ مشک اور کافور کی بو تھی۔ ایک بار پھر اسے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہونے لگا۔ کیا وہ واقعی مرچکا ہے اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا' اس کا نچلا دھڑ بالکل مفلوج ہو چکا تھا یا شاید اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے زور لگایا اور رانوں کے قریب شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ اس کے دماغ میں دھند سی چھانے لگی' اسے لگا جیسے اگلے چند لمحوں میں وہ بے ہوش ہو جائے گا۔

پھر اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑیں اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس قبرستان میں تنہا نہیں۔ چند گز کے فاصلے پر ایک تاریک سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت اور ساکت کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مراد کو شک گزرا کہ وہ کوئی ٹنڈ منڈ درخت ہے لیکن نہیں وہ کوئی شخص تھا ..... اس کے ہاتھ میں ..... اس کے ہاتھ میں کدال تھی یا شاید کسّی' اس کے قدموں میں مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گویا اس کی قبر بھی تیار ہو چکی تھی۔ آہنی اعصاب کا مالک کیپٹن مراد' پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ "میں زندہ ہوں ..... میں زندہ ہوں۔" سایہ بالکل بے حرکت رہا' اپنی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی ..... پھر اس کا ذہن گہری تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

جب کیپٹن مراد نے دوبارہ آنکھ کھولی وہ اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا' بالکل

اسی طرح جیسے رات کو سویا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ اس نے تکئے کے نیچے سے کلائی کی گھڑی نکالی' سوا دس بج چکے تھے' اس کی ماں تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی' خواب آور دوائی کا اثر ابھی تک اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا' ریاست کمرے میں داخل ہوا۔

"بھائی جان! آپ گہری نیند سو رہے تھے' اس لئے جگانا مناسب نہیں سمجھا' ماں جی کو ناشتہ کرا دیا ہے دوائی بھی کھلا دی ہے' آپ کا ناشتہ ابھی لاتا ہوں۔"

تینوں وقت کا کھانا چچا طفیل کے گھر ہی سے آتا تھا۔ ریاست باہر نکلنے کے لئے مڑا تو مراد نے اسے روک دیا۔ "میں ناشتہ نہیں کروں گا' ریاست!" اس نے تیز لہجے میں کہا اور دوسرے کمرے میں آ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں' وہ رات والے واقعے کو کسی صورت خواب تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رات چند لمحوں کے لئے ہی سہی' وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا تو پھر وہ کہاں تھا۔ اس نے سوچا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے' جنازے کا پلنگ' گلاب کے پھول' مشک اور کافور کی بو' اسے سب کچھ یاد تھا اسے اپنا سر بھاری محسوس ہو رہا تھا' نلکے پر جا کر اس نے اچھی طرح منہ دھویا اور ریاست کو ماں کے پاس چھوڑ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا' اس کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ اس قبرستان کو وہ اچھی طرح جانتا تھا' کچھ دن پہلے ان کا فوجی کیمپ اسی قبرستان کے نواح میں لگا تھا اور یہیں پر اس نے کھدائی سے برآمد ہونے والے ڈھانچے کو دفن کروایا تھا' وہ اس جگہ کو پہچانتا تھا جہاں رات اس کی لاش پلنگ پر پڑی رہی تھی۔ یقیناً وہ فولادی اعصاب کا مالک تھا' ورنہ رات اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک ذہنی توازن کھو چکتا' لیکن پھر بھی جوں جوں وہ قبرستان کے نزدیک ہو رہا تھا ایک انجانا سا خوف دل و دماغ پر طاری ہوتا جا رہا تھا' مشک اور کافور کی بو ذہن میں بھر رہی تھی' اسے ابکائی سی آنے لگی' اس کے اندر سے آواز آئی۔ "کیپٹن مراد! سنبھلو' کچھ ہوش کرو' تم مادہ پرستی کا شکار ہو' تم ہر چیز میں وجہ اور سبب ڈھونڈتے ہو۔ اب بھی کوئی سبب ڈھونڈنے کے لئے قبرستان کی طرف جا

رہے ہو۔ تم تحقیق کرنا چاہتے ہو' اب کیا تمہیں یقین نہیں کہ کچھ چیزیں انسانی عقل سے بالا تر بھی ہو سکتی ہیں ..... کیا تم روحانیت کے منکر ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈھیٹ پن میں اپنی زندگی گنوا بیٹھو۔" ایک دم اس کے جسم میں لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے قدم رک گئے' اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر کسی بارونق جگہ پر چلا جائے ..... یا کوئی نورانی شکل بزرگ ہو جو اسے اپنے لبادے میں چھپائے۔ "لبادہ ..... نورانی صورت بزرگ۔" یہ دونوں الفاظ پوری شدت سے اس کے ذہن میں گونجے اور پیر سائیں کی شبیہہ آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگی۔ وہ جتنی تیزی سے قبرستان کی طرف جا رہا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس مڑا اور بابا گلو شاہ کے مزار کی طرف چل دیا۔ سبز دروازے کے باہر دو باریش افراد نے اس کا استقبال کیا' وہ ان کے سلام کا جواب دیتا تیزی سے اندر داخل ہو گیا' کمرے کے باہر مریدوں کی جوتیاں نظر آ رہی تھیں' وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا' پھر اس کے ہاتھ اپنے جوتوں کی طرف بڑھ گئے' اس نے جوتے اتارے اور اندر چلا گیا' مریدان باصفا' سر جھکائے قطاروں میں بیٹھے تھے وہ دبے پاؤں چلتا حضرت پیر سائیں کے پاس جا پہنچا' دل پر عجیب سا خوف طاری تھا' ذہن کے نہاں خانوں میں زبردست ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی' ایک لمحے کے لئے اس کا دل چاہا کہ جھک کر پیر سائیں کے ہاتھوں کو بوسہ دے اور آنکھوں میں آنسو بھر کے ان سے کہے' حضرت مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیں' میرا دل بے سکون ہے اسے سکون کی نعمت سے نوازیں' لیکن پھر ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے سے بغاوت کا علم بلند ہوا' کوئی شے اسے انکار پر اکسانے لگی' اس کا دل چاہا کہ واپس مڑ جائے لیکن تب اسے احساس ہوا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے تعاقب میں ہے جو اس کمرے کے دروازے تک اس کے تعاقب میں رہا ہے اور جب وہ اس کمرے سے نکلے گا وہ ہاتھ پھر اس کے تعاقب میں لگ جائے گا اور جونہی رات کا اندھیرا پھیلا اسے پکڑ کر اس سنسان قبرستان میں لے جائے گا ..... یقیناً وہ سب خواب نہیں تھا' یقیناً وہ خواب نہیں تھا اسے جھرجھری آ گئی' اس کے ہونٹوں سے خود بخود نکلا۔ "حضرت سائیں!" زرد چادر کے اندر حرکت پیدا ہوئی' پھر سائیں پیر کا بارعب چہرہ اس کے سامنے

آیا۔ وہ جیسے خود بخود ان کے پاس بیٹھ گیا انداز نہ چاہنے کے باوجود مؤدبانہ تھا' پیر سائیں کی بڑی بڑی خوابیدہ آنکھیں آج کچھ زیادہ ہی خوابیدہ نظر آ رہی تھیں۔

"ایک پیلا کاغذ ..... ایک پیلا کاغذ!" پیر سائیں نے وجدانی کیفیت میں کہا۔

"کیا حضرت سائیں!" مراد نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"ساری مصیبتوں کی جڑ ایک پیلا کاغذ ..... تمہارے پاس یا شفیع محمد کی بیوہ کے پاس....."

"کون سا پیلا کاغذ حضرت سائیں!"

حضرت سائیں نے جیسے مراد کی آواز سنی ہی نہیں سرگوشی کے انداز میں بار بار ایک ہی لفظ دوہرا رہے تھے۔ "پیلا کاغذ ..... پیلا کاغذ....."

ایک مرد نے مراد کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مراد نے دیکھا کہ حضرت سائیں کا چہرہ چادر میں چھپ گیا ہے اور وہ پھر مراقبے میں پہنچ گئے ہیں' مراد اٹھا اور مرید کے ساتھ چلتا ہوا باہر صحن میں آ گیا' مرید نے اسے ایک چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

"حضرت سائیں کا کہنا ہے کہ آپ کے پاس یا آپ کی والدہ کے پاس کوئی پیلا کاغذ ہے جو ساری مشکلوں کی جڑ ہے' آپ اس کاغذ سے جتنی جلدی چھٹکارہ حاصل کر لیں اتنا ہی بہتر ہے۔"

"پیلا کاغذ!" مراد نے زیر لب دوہرایا' اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

مرید نے کہا۔ "آپ اپنے ذہن پر زور دیں' ہو سکتا ہے کچھ یاد آ جائے۔ اگر وہ کاغذ مل جائے تو حضرت صاحب سے پوچھ لیں کہ اس کا کیا کرنا ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر اندر چلا گیا' مراد کچھ دیر شش و پنج میں سوچتا رہا۔ پھر پژمردہ قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆==========☆==========☆

مراد کرسی پر نیم دراز گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذہن صبح سے اب تک پیلے کاغذ

میں الجھا ہوا تھا' اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی' اس نے کھدائی سے برآمد ہونے والی تمام اشیاء ایک ایک کر کے دیکھی تھیں لیکن ان میں اسے کوئی پیلا کاغذ نہیں ملا تھا۔ ماں کا سامان تو تھا ہی نہیں' بس بوسیدہ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ وہ بھی اس نے دیکھ ڈالی تھی' گھر کے کونے کھدرے بھی چھانے تھے' کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

جب اس کی ماں کو دورہ پڑتا تھا تو وہ کسی کاغذ کی باتیں کرتی تھی اور اب پیر سائیں نے بھی کسی کاغذ کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیسا کاغذ تھا جس کی وجہ سے اس کے خاندان پر مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں' اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ بچپن میں اس کی ماں کہا کرتی تھی بیٹا جہاں کہیں بھی کوئی لکھا ہوا کاغذ زمین پر پڑا دیکھو فوراً اٹھالو۔ وہ اور اس کا بھائی شمشاد اس ہدایت پر سختی سے عمل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر قرآن یا سپاروں کے کاغذ وہ بڑی احتیاط سے اٹھا کر اور چوم کر کسی دیوار کی درز میں پھنسا دیا کرتے تھے۔ بچپن میں بھی ان کے ذہنوں میں یہ خیال موجود تھا کہ ایسے کاغذوں کی بے ادبی کرنے والے پر مصیبت نازل ہوتی ہے ..... قرآنی سپاروں کے کاغذ بھی زردی مائل ہوتے ہیں۔ کہیں پیر صاحب نے کسی ایسے کاغذ کا ذکر ہی نہ کیا ہو۔ یہ اور اسی طرح کے بہت سے خیال اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ٹانگ میں ہلکی سی ٹیس اٹھی اور پھر اس کی نگاہ کھڑکی سے ہوتی ہوئی گلی کے پار والے آنگن میں پڑی' دروازے میں پڑی چق میں حرکت پیدا ہوئی اور مسرت کا سراپا نظر آیا' پچھلے دو دنوں میں یہ چوتھی یا پانچویں دفعہ تھی جب اس نے مسرت کو دیکھا تھا۔ ایکا ایکی اس کا ذہن ہر قسم کے خیالات سے خالی ہو گیا' یک ٹک مسرت کو دیکھنے لگا۔ اس نے آدھے بازوؤں والی سیاہ پھولدار قمیض پہن رکھی تھی ..... دوپٹہ اوڑھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس بات سے باخبر ہے کہ کھڑکی سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے' سیاہ دوپٹے کی اوٹ سے اس کا سفید چہرہ کچھ اور بھی سفید نظر آ رہا تھا۔ اس کی ماں صحن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی' وہ ماں کے عقب میں جا کر کھڑی ہو گئی اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی' اس سے پہلے بھی کئی بار مراد سے اس کی نظریں چار ہوئی تھیں لیکن آج مراد اس کی آنکھوں میں کچھ اور ہی طرح کی بے باکی محسوس کر رہا تھا' لیکن اس بے باکی میں

بھی سنجیدگی کا عنصر غالب تھا' مراد اب تک کوشش کے باوجود ریاست سے مسرت کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی اتنی ہمت ہی نہیں پڑی تھی لیکن قرائن بتا رہے تھے کہ مسرت ابھی غیر شادی شدہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس کے دل میں مراد کے لئے ایک گوشہ مدت سے خالی پڑا ہو۔ مراد نے دیکھا وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی گھر سے باہر نکل رہی تھی۔ ایکا ایکی مراد کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں' اسے محسوس ہوا' جیسے مسرت کی آنکھیں اسے کوئی پیغام دے رہی ہیں' کیا اسے اس کے پیچھے جانا چاہئے؟ کیا یہ چھچھوری حرکت تو نہیں ہو گی؟ کیا وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ مراد چند لمحے سوچتا رہا پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا' شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے' گھروں کے اندر سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے' گلیوں میں کھیلنے والے بچے اب اپنی اپنی مرغیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے' گلی میں کھڑی چند عورتیں مراد کو دیکھ کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں' وہ دھیمے قدموں سے چلتا کھیتوں کی طرف بڑھ رہا تھا' کل رات اور آج صبح کے تمام واقعات اس کے ذہن سے محو تھے یا اس نے خود محو کر دیئے تھے۔ اس وقت وہ صرف مسرت کے متعلق سوچ رہا تھا' ان دونوں کا درمیانی فاصلہ ایک فرلانگ کے قریب تھا لیکن وہ اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے' اس کے دل میں ایک انجانی سی گونج شامل ہو گئی تھی اور ذہن آنے والے لمحات کے تصور میں کھویا ہوا تھا' جب گاؤں سے نکل کر وہ کھیتوں میں پہنچے۔ ہر طرف اندھیرے کی چادر بچھ چکی تھی ..... مسرت نے ایک دو بار مڑ کر دیکھا تھا اور اس نے مراد کے اندازوں کی تصدیق ہوتی تھی۔ وہ یقیناً اس سے ملنا چاہتی تھی وہ مزید اعتماد سے آگے بڑھنے لگا' اندھیرے کی وجہ سے اب مسرت اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرا' اچانک اسے ایک مدھم آواز سنائی دی "سنئے" وہ ٹھٹک کر رک گیا' مسرت اس سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کا دبلا پتلا سراپا ایک درخت کے نیچے نظر آ رہا تھا' وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا' وہ کالج کا نوجوان نہیں تھا ایک تجربہ کار فوجی افسر تھا لیکن مسلح دشمن سے آنکھیں چار کرنے والا آنکھیں چرا رہا تھا' اسے کچھ سمجھ نہیں

آ رہی تھی کہ کیا کہے۔ مسرت نے "سنئے" تو کہہ دیا لیکن اب وہ بھی ہچکچا رہی تھی۔

آخر مراد نے حوصلہ کیا۔ "السلام علیکم! اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ..... تم مسرت ہو۔"

"ہاں ..... اور تم مراد ہو۔" قدرے بے باکی اور بے تکلفی سے جواب ملا۔ اس بے تکلف لہجے نے مراد کو بچپن کے بھولے بسرے لمحوں کی یاد دلا دی اسے اپنی ہچکچاہٹ ایک دم دور ہوتی محسوس ہوئی' وہ چہک کر بولا۔

"تم اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ یقین نہیں آتا۔" تھوڑی دیر وہ ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے' پھر مراد نے کہا۔ "مسرت! میں تم سے بہت باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن ..... لیکن میں تم سے صرف چند باتیں کرنا چاہتی ہوں' اور اس سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں' ہاں کہو۔" مراد نے فراخدلی سے کہا ..... اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے تو وہ شاید اسے کبھی اپنے خوبصورت ہونٹ کھولنے کی اجازت نہ دیتا۔

"مراد!" مسرت نے سر جھکا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ..... اور مراد کو یوں لگا جیسے میدانِ جنگ میں دشمن توپ کا پھینکا ہوا گولہ اس کے قریب پھٹنے والا ہو اور گولہ گرنے سے پہلے کی باریک سیٹی نما آواز سنائی دے رہی ہو۔ مسرت نے کہا۔

"میں شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہوں۔"

گولہ ایک چمکدار دھماکے سے پھٹا' ایک لمحے کے لئے مراد کا دماغ سُن ہو گیا' آنکھیں جیسے چندھیا گئیں اور ان چندھیائی ہوئی آنکھوں میں رسی پر جھولتی ایک چھوٹی سی قمیض گھوم گئی۔ "اوہ مائی گاڈ' یہ تو واقعی شادی شدہ ہے۔" اس کا ذہن چیخ اٹھا۔

"لیکن ..... تم تو اپنے گھر میں اکیلی رہتی ہو ....." مراد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی بچہ ضد کرتا ہے۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے' پھر کبھی پوچھ لینا۔" مسرت غمگین انداز میں سر جھکا کر بولی "میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتی تھی لیکن ..... حالات ایسے ہیں کہ تم سے

ملاقات نہیں ہو سکتی تھی' اس لئے یہ قدم اٹھایا ہے....."

"میں سمجھ رہا ہوں مسرت!" مراد نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں اس سے کوئی غلط مطلب نہ لوں۔"

مسرت نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' پھر دوپٹہ درست کرتی ہوئی بولی۔

"مراد ..... تم سے پیر سائیں نے کوئی چیز مانگی تھی..... .....؟"

مراد کے ذہن میں فوراً پیلے کاغذ کا خیال آیا اس نے کہا۔ "ہاں ..... مانگی تھی....."

مسرت نے کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم پیر سائیں کا زیادہ اعتماد نہ کرنا اور نہ ہی اس سے اتنا میل جول رکھنا وہ ..... ٹھیک آدمی نہیں ہے۔"

مراد حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پیر سائیں کے بارے میں ابھی تک اس نے اس قسم کی رائے نہیں سنی تھی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو مسرت.....؟" مراد نے تیزی سے پوچھا۔

مسرت نے اس کی جانب سے تھوڑا سا رخ پھیرا' ایسے میں اس کے رخسار پر جھولتا ہوا خوبصورت جھمکا دکھائی دینے لگا وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ "مراد! تمہاری ماں ایک عرصے سے مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے اور تم بھی آتے ہی مشکلوں میں گھر گئے ہو۔ میں ماں جی کی حالت پر چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہی ہوں لیکن کمزور عورت ہوں ان کے لئے کچھ کر نہیں سکتی۔ نہ ہی میں جانتی ہوں کہ ان مشکلوں کی وجہ کیا ہے؟ جتنی بات مجھے معلوم تھی وہ میں نے بتا دی ہے' اب تمہاری مرضی اسے سچ جانو یا جھوٹ۔"

مراد کے ذہن میں بچپن کی یادیں آئیں' اس کی آنکھیں کوئی گزرا ہوا منظر دیکھ رہی تھیں' مسرت اور وہ اکٹھے کھیلا کرتے تھے' مسرت اس سے تھوڑی سی چھوٹی تھی لیکن لڑکیاں عمر کے مقابلے میں زیادہ سیانی ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسے بڑی بوڑھیوں کی طرح روک ٹوک کرتی رہتی تھی' یہ نہ کرو چوٹ لگ جائے گی' وہاں نہ جاؤ جن پکڑ لیں گے

وغیرہ وغیرہ ..... ایک دفعہ ..... ایک دفعہ مراد نے عجیب حرکت کی تھی' ان کے برآمدے کی چھت سرکنڈوں کی تھی' سرکنڈوں کے نیچے لکڑی کی کڑیاں اور چیل کے شہتیر تھے۔ کڑیوں کے درمیان خالی جگہوں پر چڑیوں نے گھونسلے بنائے تھے اور انڈے دینے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ یہ گھونسلے کافی نیچے کو لٹکے ہوئے تھے ایک دن ننھے مراد نے منصوبہ بنایا کہ ایک بڑے گھونسلے کو جلا دیا جائے' اس کی والدہ اِدھر اُدھر ہوئیں تو اس نے جلتے ہوئے چولہے سے ایک لمبی لکڑی کو آگ لگائی اور گھونسلے کی طرف بڑھا' مسرت اسے روکتی رہ گئی لیکن اس نے گھونسلے کو آگ لگا دی' دیکھتے ہی دیکھتے گھونسلہ جل گیا اور چھت کے سرکنڈوں نے آگ پکڑ لی' معصوم مراد سہما ہوا گھر پھونک کر تماشا دیکھتا رہا لیکن مسرت چیختی ہوئی بھاگی اور دوسرے گھر والوں کو اس کی اطلاع دی جب تک گھر والے پہنچتے دو کڑیوں کے درمیان سارے سرکنڈوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ اس کی والدہ' والد اور شمشاد نے صحن میں پڑے مٹکوں سے پانی نکال نکال کر چھت پر پھینکا' قسمت اچھی تھی جو آگ بجھ گئی۔

یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر مراد کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا' اس نے سوچا کیا مسرت آج بھی ویسا ہی کردار ادا کر رہی ہے' کیا آج بھی وہ اسے کسی آنے والی مصیبت سے آگاہ کر رہی ہے' اس کی آواز سن کر وہ چونکا۔

"اچھا میں چلتی ہوں' ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" وہ قدم بڑھاتی ہوئی بولی۔

"اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔" مراد نے پوچھا۔

"منا مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔" وہ سنی اَن سنی کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

مراد اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ برسوں سے ذہن کے نہاں خانوں میں تعمیر ایک خوبصورت گھروندہ ریت کا تھا ..... اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔

رات وہ دیر تک جاگتا رہا اور اب تک پیش آنے والے حالات کے متعلق سوچتا رہا۔ مسرت کی کہی ہوئی بات سے اس کے ذہن میں پیر سائیں کے بارے میں پھر شبہات

اٹھنے لگے تھے' لیکن جب وہ اس انداز میں پیر سائیں کے متعلق سوچتا تو دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہو جاتا وہ ایکا ایکی خود کو روحانی طور پر لاوارث سا محسوس کرنے لگتا۔ آدھی رات کے بعد تک اسے نیند نہیں آئی۔ شاید اس کے دل میں یہ خوف تھا کہ سویا تو پھر کل رات والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ کتنی ہی دیر وہ اپنے خوف سے لڑتا رہا' آیت الکرسی اس کے ہونٹوں پر جاری تھی' پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

غنودگی کے عالم میں اس نے ایک عجیب منظر دیکھا اس نے دیکھا کہ ساتھ والی چارپائی سے اس کی ماں بیدار ہوئی' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا شاید پانی تلاش کر رہی تھی۔ پانی تھوڑی دور ایک میز پر پڑا تھا' چارپائی سے اترے بغیر وہ گلاس تک نہیں پہنچ سکتی تھی ..... پھر اس نے ایک نظر مراد کی طرف دیکھا' اس نے سمجھا کہ وہ سو رہا ہے اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا ..... اس کا ہاتھ لمبا ہوتا چلا گیا۔ تین فٹ' چار فٹ' چھ فٹ' چارپائی پر لیٹے لیٹے اس نے گلاس تھام لیا۔ مراد کو محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک گئی ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر سر سے پاؤں تک دوڑ گئی' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا' اس نے دہشت زدہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا وہ تکیے سے ٹیک لگائے پانی پی رہی تھی' اس کو جاگتے دیکھ کر وہ چونک گئی' پھر اس نے گلاس چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔

"کیا بات ہے پتر؟" وہ ممتا بھرے لہجے میں بولی۔ "شاید تم نیند میں ڈر گئے ہو۔ ابھی زور زور سے آیت الکرسی پڑھ رہے تھے۔" مراد کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا' اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے خواب دیکھا تھا یا جاگ رہا تھا۔ اگر خواب دیکھا تھا تو کب تک دیکھا تھا اور اگر جاگ رہا تھا تو کب سے جاگ رہا تھا ..... اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں ..... شاید کل رات کے واقعے نے اس کے ذہن پر بوجھ ڈالا تھا اور اسے ڈراؤنے خواب آ رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا' نورانی' پاک اور مقدس چہرہ' ایک عجیب طرح کی توانائی' آنکھوں کے راستے دل و دماغ میں اتر گئی' وہ چارپائی سے اترا اور ماں کی گود میں سر چھپا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ماں آہستہ آہستہ

اس کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی' مراد کو لگا کہ وہ دنیا کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں ہے اور یہ احساس اسے نیند کی پُرسکون وادیوں میں لے گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی وہ اسی طرح ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ جاگتے ہی اس کے ذہن میں جو سب سے پہلی بات آئی وہ پیلے کاغذ کے متعلق تھی اسے لگا جیسے اس نے پیلے کاغذ کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک پیلا کاغذ گھوم رہا تھا یہ لفافہ مورچوں کی کھدائی میں اس گول ڈبے سے برآمد ہوا تھا جو انسانی ڈھانچے اور صندوق کے قریب پڑا ہوا تھا۔ مراد نے یہ لفافہ ڈبے سے نکال کر جیب میں رکھ لیا تھا' اب وہ اسے بالکل فراموش کر چکا تھا۔ دراصل انسانی ڈھانچے کی دریافت کے بعد واقعات اوپر تلے اتنی تیزی سے رُونما ہوئے تھے کہ پیلے لفافے کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا .....

رات وہ تو پریشانی میں سو گیا تھا لیکن ذہن کا کمپیوٹر مصروف رہا تھا اور صبح اٹھتے ساتھ ہی اس نے رزلٹ پیش کر دیا تھا۔ اسے پیلا لفافہ یاد آگیا تھا۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پیلا لفافہ..... پیلا لفافہ اس نے کہاں رکھا تھا۔ یہ بہت اہم لفافہ تھا۔ اسی سے مراد کو اپنے گھر اور گھر والوں کا علم ہوا تھا' اس لفافے میں کوئی اور پتہ بھی لکھا ہوا تھا ..... وہ تیزی سے سوچنے لگا۔ اس نے یہ لفافہ اپنی وردی کی جیب میں ڈالا تھا پھر وہاں وہ سلیپنگ سوٹ کی قمیض میں منتقل ہو گیا تھا' وہ دھاری دار قمیض کہاں تھی ..... وہ جلدی سے دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی کی طرف بڑھا' قمیض گندی ہو گئی تھی اور اس نے دوسرے کپڑوں کے ساتھ کھونٹی پر لٹکا دی تھی لیکن اب وہاں کوئی کپڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بڑی افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن قمیض کہیں نظر نہیں آئی' آخر کہاں گئی وہ قمیض ..... نہ جانے کیوں اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ وہی لفافہ ہے جس کی طرف پیر سائیں نے اشارہ کیا تھا ..... پھر اچانک اسے کوئی خیال آیا اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ صحن سے ہوتا ہوا وہ گلی میں پہنچا اور ریاست کے مکان پر دستک دینے لگا۔ دروازہ کھولنے والا ریاست تھا' وہ مراد کو دروازے پر دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"خیریت تو ہے بھائی جان' آپ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

"کچھ نہیں ریاست! یار میرے کمرے میں کھونٹی پر ایک دھاری دار قمیض لٹک رہی تھی' تم نے تو نہیں دیکھی؟"

"ارے بس اتنی سی بات تھی۔" ریاست مسکرایا۔ "وہ قمیض تو دوسرے کپڑوں کے ساتھ کل میں اٹھا لایا تھا۔ وہ کپڑے میں نے بلقیس کو دھونے کے لئے دیئے ہیں.....!"

"بات قمیض کی نہیں' اس کی جیب میں ایک بڑا ضروری کاغذ ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔" ریاست بولا۔ "میرا خیال ہے کپڑے ابھی اندر ہی پڑے ہیں' ان میں سے قمیض نکال لیتے ہیں۔"

دونوں صحن میں داخل ہوئے' ریاست نے اپنی بہن بلقیس کو آواز دی' بلقیس کی بجائے اس کی ماں برآمد ہوئی۔ ریاست کی بجائے جلدی سے مراد نے پوچھا۔ "چاچی! بلقیس کہاں ہے؟"

چاچی نے بتایا کہ وہ تو ابھی ابھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کنویں پر کپڑے دھونے گئی ہے۔

"کپڑے دھونے گئی ہے؟" مراد نے بوکھلا کر پوچھا' پھر چاچی کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا' ریاست اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا' مراد نے گلی پار کی' دن کافی چڑھ آیا تھا' مکانوں کے سائے دوسرے مکانوں سے اتر آئے تھے۔ لمبی لمبی قمیضیں پہنے ننگی ٹانگوں والے بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے' ایک احاطے میں کچھ عورتیں اپلے تھاپنے میں مصروف تھیں' ان کے قریب پہنچ کر مراد کو اپنی رفتار سست کرنا پڑی پھر بھی عورتوں نے اس کی طرف عجیب مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ جونہی عورتیں نظروں سے اوجھل ہوئیں وہ پھر دوڑنے لگا' اسی طرح کبھی چلتا اور کبھی دوڑتا ہوا وہ قریباً پانچ منٹ میں کنویں پر پہنچ گیا۔ یہ کنواں گاؤں سے کچھ ہٹ کر تھا اور شمالی گاؤں کی عورتیں یہیں کپڑے دھوتی تھیں۔ چار پانچ عورتیں اب بھی وہاں نظر آ رہی تھیں' مراد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ سب ہاتھ روک کر بیٹھ گئیں۔

"میری دھاری دار قمیض کہاں ہے؟" مراد نے قریب پہنچتے ہی بلقیس سے پوچھا۔

بلقیس نے پہلے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا پھر انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا' ایک جگہ کسی جھاڑی کی سوکھی ہوئی شاخوں کا ڈھیر لگا تھا اور اس پر لڑکیوں نے دھلے ہوئے کپڑے پھیلا رکھے تھے' پھر اچانک جیسے بلقیس کو کچھ یاد آیا اس نے جلدی سے آواز دی۔

"مسرت!" ایک لڑکی کچھ دور بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ بلقیس کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا وہ مسرت ہی تھی' پھر اس کی نگاہ مراد پر پڑی اور وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ کمر سے پاؤں تک اس کا لباس گیلا ہو کر جسم سے چپکا ہوا تھا' چوٹی کھلی تھی اور بال پشت پر لہرا رہے تھے' بلقیس نے کہا۔

"اری! میں نے ابھی تجھے کاغذ دیا تھا کہاں ہے؟"

مسرت کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے الجھن کے آثار نظر آئے' پھر جیسے وہ اس کی بات سمجھ گئی۔ اس نے جلدی سے رخ پھیرا اور گریبان سے ایک پیلا لفافہ نکال کر بلقیس کی طرف بڑھا دیا۔

"بھیا! تم یہ تو نہیں ڈھونڈ رہے!" بلقیس نے کہا' مراد کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی اس نے جلدی سے لفافہ جھپٹ لیا' پھر اس کی نظر مسرت پر پڑی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے' تب اچانک اس نے رخ پھیرا' اور کچھ دور جا کر کپڑے دھونے لگی' اس کے انداز پر مراد چونکے بغیر نہ رہ سکا' اس نے گھوم کر دیکھا ریاست کھیتوں کے درمیان تیز تیز چلتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اچھا تو یہ ریاست تھا جسے دیکھ کر مسرت کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی' لیکن ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ..... پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا ..... کہیں ریاست ہی تو مسرت کا خاوند نہیں۔

کنویں سے گاؤں واپس جاتے ہوئے مراد اور ریاست میں جو باتیں ہوئیں ان سے مراد کے اندازے کی تصدیق ہو گئی' ریاست ہی مسرت کا خاوند تھا' دو سال قبل ان کی شادی ہوئی تھی' اولاد کوئی نہیں تھی۔ قریباً چھ ماہ سے وہ علیحدگی کی زندگی گذار رہے تھے۔

میاں بیوی کے درمیان کوئی جھگڑا تھا جس کی تفصیلات ریاست نے نہیں بتائیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مسرت نے کسی دوسرے بچے کو گود لے رکھا ہے۔ مراد نے محسوس کیا کہ ریاست اس کے سوالوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے' گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے ریاست اس ضروری کاغذ کے متعلق پوچھنے لگا جس کے لئے مراد دیوانہ وار بھاگتا ہوا کنویں تک پہنچا تھا' مراد نے کہا کہ اس بارے میں وہ جلدی اسے بتائے گا۔

گھر پہنچ کر مراد سیدھا ماں کے پاس پہنچا' ماں کی حالت اب کافی بہتر تھی' وہ آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرنے لگی' مراد اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا گفتگو شروع ہوئی' پہلے کتنی ہی دیر تو جنتے بیٹے کو یہ مشورہ دیتی رہی کہ وہ یہاں سے چلا جائے' لیکن پھر اس کے چہرے پر نظر آنے والے عزمِ مصمم نے اسے سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا' وہ جو کہانی سنا رہی تھی' مراد اس کا بہت سا حصہ پہلے سے جانتا تھا بلکہ وہ ساری کہانی سن چکا تھا۔

ماں نے اسے بتایا۔ "6 ستمبر 1965ء کی صبح تمہارے باپ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا' اس وقت دور سے دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان دھماکوں سے گاؤں کے در و دیوار لرزنے لگے۔ لوگوں نے کہا بھاگو' ہندوستانی فوج آ رہی ہے' میں نے تمہیں اٹھایا اور تمہارے باپ نے تمہارے بڑے بھائی شمشاد کو۔ تھوڑا سا سامان لے کر ہم گھر سے بھاگ نکلے۔ گاؤں کی گلیوں میں قیامت کا سماں تھا' توپوں کے گولے دھماکوں سے گر رہے تھے اور جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ پھر لوگوں کا ایک ریلا آیا اور مجھے تم سب سے جدا کر گیا ..... تمہارا باپ اور شمشاد نہ جانے کس طرف نکل گئے' ایک زوردار دھکا کھا کر میں کیچڑ میں گری' تم میرے بازوؤں سے نکل کر دور جا گرے ..... میں بہت چیخی چلائی لیکن رات کے اندھیرے میں کسی نے میرا ہاتھ نہیں تھاما' کسی نے مجھے ماں کہہ کر نہیں پکارا۔" ماں یادوں کے زخم کریدتے ہوئے سسکنے لگی' مراد اسے دلاسہ دینے لگا وہ ایک ایسی درد بیتی سنا رہی تھی جس کے ہر موڑ پر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے اور بار بار مراد کو یہ آنسو پونچھنے پڑتے تھے ..... جب وہ ان کالے کپڑے والوں کے متعلق بتانے لگی جو اسے کئی بار زد و کوب کر چکے تھے تو ایک بار پھر اس

کی حالت بگڑنے لگی۔ مراد نے اس ذکر کو وہیں ختم کر دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا' وہ پیر سائیں کے بارے میں ماں کے خیالات جاننا چاہتا تھا۔ جب اس نے گفتگو کا رخ اس طرف موڑا تو اسے اندازہ ہوا کہ ماں پیر سائیں کے متعلق بھی بات کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ پیر سائیں کے متعلق اس کے جذبات' خوف اور احترام کی ملی جلی کیفیت کے حامل تھے وہ اسے بہت پہنچا ہوا آدمی بھی کہتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اس نے اسے مکان میں ناجائز قید کر رکھا تھا' مراد نے اپنے ماموں کی موت اور مسجد کے امام صاحب کی گمشدگی کا ذکر کیا تو جنتے کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ ایک بار پھر مراد کو واسطے دینے لگی کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ مراد نے باتوں باتوں میں پیلا لفافہ جیب سے نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا' ماں کی نظر اس پر پڑی لیکن اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا' بہت دیر ماں کے پاس بیٹھ کر جب وہ اٹھا تو اس کی رائے یہ تھی کہ ماں کے ذہن پر پُراسرار واقعات کا بے انتہا بوجھ ہے اور وہ کوئی صحیح رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں' وہ پیلا لفافہ لے کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ اس لفافے کو بیس سال پہلے خط نکالنے کے لئے چاک کیا گیا تھا۔ لوہاراں والی ڈاک خانے کی مہر صاف پڑھی جاتی تھی' لفافے پر اندر کی طرف بھیجنے والے کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ "ایڈووکیٹ ملک مختار' مکان نمبر 12 گلی نمبر 6 نجف کالونی۔" شہر کا نام مٹ چکا تھا' لیکن لفافے پر جو دوسری مہر نظر آ رہی تھی اس پر چند حروف صاف پڑھے جاتے تھے' مراد اس مہر کو دیکھتا رہا..... دیکھتا رہا..... پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں..... وہ ادھورا ایڈریس مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا..... اس نے ایک فیصلہ کیا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆==========☆==========☆

ڈیڑھ دن کے مسلسل سفر کے بعد وہ لاہور پہنچا۔ پہلے گھوڑا' پھر تانگہ اور آخر میں بس۔ جب وہ لاہور سٹیشن پر اترا تو تھکن سے چُور تھا۔ لاہور روانہ ہونے سے پہلے وہ مقامی تھانیدار سے ملا اور تھانیدار نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی والدہ کی حفاظت کے لئے مسلح گارڈ مہیا کر دی تھی۔ جس وقت وہ گاؤں سے روانہ ہوا تھا اس کا ذہن ادھیڑ بن

کا شکار تھا لیکن جوں جوں وہ گاؤں سے دور ہوتا گیا تھا ذہن پر چھائی ہوئی وسوسوں کی دھند چھٹتی گئی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تک گھٹن کا شکار تھا۔ باہر کی تازہ ہوا' اس کے ذہن کے دریچے کھول رہی تھی۔ عقل کے مرجھائے ہوئے پودے پر سوچ اور دلیل کے پتے نکل رہے تھے' اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے لوہاراں والی کو نہیں چھوڑا' ایک آسیب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے' ایسا آسیب جس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو زنجیر کر کے ایک مفلوج انسان بنا دیا تھا۔ وہ ذہن کی اس خوشگوار تبدیلی پر خوش تھا۔ شاید اس لئے وہ سٹیشن سے پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا' اس گھر کی طرف جہاں اس نے ماں باپ سے بچھڑ کر زندگی کے بیس سال گذارے تھے۔ وہ جانتا تھا اس کی خالہ شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ تیز تیز چلتا رہا' اس نے سڑکوں پر رواں ٹریفک دیکھی' دکانوں کے جگمگاتے نیون سائن دیکھے' کرکٹ اور ہاکی کھیل کر واپس آتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا۔ مارکیٹوں اور پلازوں کے سامنے خریداروں کے ہجوم پر نظر ڈالی۔ ویڈیو گیمز کھیلتے ہوئے بچوں کے ذہین چہرے دکھائی دیئے..... ایکا ایکی اسے چار پانچ روز پہلے کی باتیں خواب لگنے لگیں' وہ دور دراز قبرستان میں جنازے کا پلنگ' اس کی ماں کا لمبا ہوتا ہوا ہاتھ' یہ سب کیا تھا..... "کیا تھا یہ سب؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ اپنی خوبصورت کوٹھی کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن آگے بڑھنے کی بجائے وہ وہیں ایک پارک میں پتھر کے بنچ پر بیٹھ گیا' اس نے جیب سے پیلا لفافہ نکالا اور بے خیالی میں دیکھنے لگا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا جو وہاں سے نکل آیا تھا۔ اس گاؤں نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ وہیں رہتا تو اپنے پاؤں پر چل کر یہ لفافہ پیر سائیں کو پیش کرتا۔ بلکہ وہ تو اس ارادے سے چل بھی دیا تھا لیکن اس کے کانوں میں مسرت کی آواز گونجی تھی۔ "پیر سائیں تم سے جو کچھ مانگ رہا ہے اسے مت دینا..... وہ ٹھیک شخص نہیں۔"

"مسرت نے ٹھیک کہا تھا..... بالکل ٹھیک کہا تھا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "یہ کوئی بہت گہرا چکر ہے..... کوئی گہرا راز ہے..... پیر سائیں کے چہرے کے پیچھے کوئی اور چہرہ ہے..... میں..... میں اس چہرے کو ظاہر کر کے رہوں گا

..... میں اس سحر کو توڑ دوں گا جو پیر سائیں اور اس کے حواریوں نے نامعلوم زمانے سے گاؤں والوں پر کر رکھا ہے....." ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک بڑے قد کا خونخوار کتا اندھیرے سے نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ کتے کی آنکھیں تاریکی میں چراغوں کی طرح روشن تھیں اور منہ سے عجیب طرح کی غراہٹ نکل رہی تھی' مراد نے اس کی غراہٹ سنی اور ایک لمحے میں اسے یقین ہو گیا کہ کتے کی نیت ٹھیک نہیں وہ بہ آہستگی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا' کتے کی دُم تیزی سے حرکت کر رہی تھی اور وہ اس پر چھلانگ لگانے کے لئے جسم تول رہا تھا' کتے کی اچانک آمد نے مراد کو سخت حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ بھاگے یا کھڑا رہے۔ قرب و جوار میں کوئی ایسی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی جسے کتے کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکے ..... پھر اس سے پہلے کہ کتا اس پر اپنے نوکیلے دانت آزماتا ایک سریلی آواز آئی۔ "جمی ..... جمی۔" ایک لڑکی بھاگتی ہوئی درختوں کی اوٹ سے نکلی اور اس نے جھک کر کتے کی زنجیر تھام لی' یہ ایک اٹھارہ انیس سالہ دوشیزہ تھی۔ جسم پر چست پتلون اور جیکٹ ..... ماتھے پر سرخ رنگ کا ربن بندھا ہوا تھا' اس نے مراد پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور واپس مڑی۔

مراد نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ کتا ابھی مجھ پر حملہ کرنے والا تھا۔ آپ کو احتیاط کرنی چاہئے۔"

مراد کا یہ فقرہ ایک تلخ تکرار کی تمہید ثابت ہوا' لڑکی کو تو جیسے کسی بہانے کی ضرورت تھی' اس نے اپنی تیز باریک آواز میں اس پر کڑوی کسیلی انگریزی کی بارش شروع کر دی' وہ بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے مراد کو گنوار اور پتہ نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھی اس سے پہلے کہ ان کی تکرار سنگین صورت اختیار کرتی اور پارک میں گھومتے اکا دکا افراد ان کی طرف متوجہ ہوتے' ایک فیشن ایبل سی خاتون جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوئی اور مراد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی ..... خاتون نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے بال کٹے ہوئے تھے لیکن چہرے سے سنجیدگی اور متانت کا اظہار ہوتا تھا۔ "مائی سن

مراد!" اس نے حیرت سے کہا ..... "تم کب آئے؟"

"بس ابھی ابھی خالہ جان' پارک سے گزر رہا تھا کہ یہ کتا....."

لڑکی حیرت سے کبھی مراد اور کبھی خاتون کی طرف دیکھتی تھی۔ "ارے اچھا" خاتون نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ "یقیناً ٹینا کے جمی نے کچھ گڑبڑ کی ہے ..... مراد یہ ٹینا ہے' اپنے آخری لیٹر میں میں نے اسی کا ذکر کیا تھا۔ یہ میری مرحومہ سہیلی کی نشانی ہے' اس سے ملو گے تو باغ باغ ہو جاؤ گے۔"

مراد نے ہنس کر کہا۔ "تار تار ہونے سے تو بچ گیا ہوں' باغ باغ ہونا بھی دیکھ لیں گے۔"

لڑکی اس کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مراد نے "ہیلو" کہا۔ اس نے بھی خوش دلی سے جواب دیا' خاتون مراد کا ہاتھ پکڑ کر پارک کے دروازے کی طرف چل دی۔ قریب ہی ان کی کوٹھی تھی۔

جس وقت خالہ "بیڈ ٹی" پی کر اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں مراد دیر ہوئے لان میں ٹہل رہا تھا' دن کافی چڑھ آیا تھا قریباً نو بج رہے تھے' ایک نوکرانی کھڑکیوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی' خالہ کو دیکھ کر مراد گھاس پر بچھی کرسیوں کی طرف آ گیا' دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مراد نے رات ہی خالہ کو ان حالات سے آگاہ کر دیا تھا جن میں وہ پچھلے کئی دن سے گرفتار رہا تھا۔ اس کی یہ اطلاع خوشگوار حیرت سے سنی گئی تھی کہ اسے اپنی بچھڑی ہوئی ماں مل گئی ہے۔ خالہ آسی پیر سائیں کے متعلق سن کر خوب ہنسی تھیں۔ اس ہنسی میں ٹینا نے بھی برابر کا ساتھ دیا تھا۔ بھلا وہ کیوں نہ ہنستی' خالہ آسی اگر ڈبل ایم اے تھیں تو ٹینا بھی سائیکالوجی میں پری گریجوایشن کر رہی تھی۔ انگریزی ادب پر خالہ کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے پہلے ایم اے انگلش اور پھر لسانیات میں ایم اے کیا تھا۔ خالو جان کی وفات تک وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار رہیں' بعد میں انہیں کاروبار سنبھالنے کے لئے ملازمت چھوڑنا پڑی' لیکن اب بھی مطالعے کا شوق ان میں اسی طرح موجود تھا' مراد کو انہوں نے ایک فلاحی ادارے سے گود لیا تھا' اس کی تربیت ظاہر ہے خالہ خالو نے

اپنے انداز میں کی ہو گی لیکن اس میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی تھی جو وہ چاہتے تھے' اس کی چھوٹی سی مثال "خالہ" کا لفظ تھا۔ شروع میں خالہ نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اسے "ماماں" کہہ کر پکارے لیکن اس نے کبھی خالہ کو "ماماں" نہ کہا' وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتا تھا لیکن تلفظ سے اسے "امی" کے لفظ کی خوشبو آتی تھی۔ وہ جب بھی "ماماں" کہنے کی کوشش کرتا لفظ اس کے حلق میں اٹک جاتا اور اس کی نگاہوں میں اپنی بچھڑی ہوئی ماں کا چہرہ گھومنے لگتا۔ پھر خالو نے اسے کہا تھا کہ وہ انہیں آنٹی کہہ کر پکار لیا کرے لیکن یہ لفظ بھی اسے اچھا نہیں لگا' آنٹی کے لفظ سے اس کے ذہن میں کسی "کانٹے" کا تصور آ جاتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے خالہ آسی سے آنٹی کا مطلب پوچھا تھا' انہوں نے ذہن پر بہت زور دے کر اسے بتایا تھا کہ آنٹی کا مطلب خالہ یا چچی ہوتا ہے۔ خالہ کا لفظ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اسے یہ لفظ بہت بھلا لگا اس نے خالہ سے کہا تھا "میں آپ کو آج سے خالہ کہوں گا۔"

خالہ حسبِ معمول ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھیں۔ آج انہیں اپنے "جوتوں کے شو روم" میں نہیں جانا تھا۔ شہر کے ایک جدید بازار میں یہ ایک کافی بڑی اور قدیم دکان تھی۔ خالو کے بعد خالہ نے خود کاروبار سنبھالنے کا فیصلہ کیا تھا اور عرصہ دس سال سے وہ بڑی خوش اسلوبی سے یہ فریضہ انجام دے رہی تھی' مراد کو انہوں نے اس کی خواہش کے مطابق فوج میں بھیج دیا تھا۔ اب وہ کیپٹن تھا اور خالہ ایک تجربہ کار "بزنس وومین"۔ خالہ کے چہرے پر غور و فکر کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ وہ گاؤں میں پیش آنے والے حالات پر اپنی ماہرانہ رائے دینے والی ہیں۔ آخر انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولیں

"انسان کے اندر اَن دیکھی چیزوں کے لئے ہمیشہ سے ایک خلا موجود رہا ہے۔ وہ جب اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھتا ہے اور اسے سمجھ نہیں سکتا تو اس کے اندر تحیّر اور خوف کا جذبہ جنم لیتا ہے' اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ کسی بلند و برتر قوت پر ایمان لے آئے یا کوئی معتبر اور کامل روحانی استاد اس کا ہاتھ تھام لے' گلی گلی' کوچہ کوچہ بکھرے ہوئے نام

نہاد پیر فقیر اور بہروپیئے انسان کے اس فطری تقاضے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنا کاروبار چمکاتے ہیں....."

مراد نے خالہ کی بات کاٹی۔ "لیکن خالہ! سارے پیر فقیر تو ایک جیسے نہیں ہوتے' ان میں کئی برگزیدہ ہستیاں بھی ہوتی ہیں۔"

"مائی سن! میں روحانی تحفظ کے اس انداز کو سرے سے غلط سمجھتی ہوں۔ روحانی تحفظ حاصل ہوتا ہے علم سے' اپنے اندر اور باہر کی دنیا کو سمجھنے سے اور جو سمجھ نہ آئے اسے کل کے لئے چھوڑ دینے سے ..... سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا..... دیکھو میں تمہیں بتاتی ہوں۔"

لیکن پھر خالہ اپنے طویل لیکچر کا آغاز نہ کر سکیں کیونکہ ایک کار پورچ میں آ کر رکی' دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔

"یہ کون ہے؟" مراد نے پوچھا۔ خالہ نے بتایا کہ ٹینا کا کتا کچھ بیمار ہے' رات اس نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون پر آنے کے لئے کہا تھا' مراد نے موقعہ غنیمت سمجھا اور جب خالہ آسی پورچ کی طرف بڑھ رہی تھیں وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا..... اب اسے لفافے پر لکھے ہوئے پتہ کی تلاش میں روانہ ہونا تھا۔

☆==========☆==========☆

اس کی 85 ماڈل ڈاٹسن ہموار سڑکوں پر پھسلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی' اس کا رخ نجف کالونی کی طرف تھا۔ کالونی کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی ایک جگہ سڑک کے کنارے پارک کر دی اور ملک مختار کا گھر تلاش کرنے پیدل ہی چل کھڑا ہوا۔ پیلا لفافہ جیب سے نکال کر اس نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سفید قمیض اور براؤن پتلون میں اس کا دراز جسم خوب سج رہا تھا۔ پاؤں میں چمکدار سیاہ جوتے کنکریٹ پر ٹک ٹک کی آواز پیدا کر رہے تھے' وہ دائیں بائیں مکانوں کے نمبر پڑھتا جا رہا تھا۔ شاید پیدل چلنے کی وجہ سے دائیں ٹانگ میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' اچانک اسے کسی خطرے کا احساس ہوا' اسے لگا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے' ایکا ایکی جسم کی تمام حسیں بیدار ہو گئیں بالکل

جیسے کوئی مین سوئچ دبائے اور تاریک شہر میں لاتعداد بتیاں روشن ہو جائیں۔ اس کا جسم الرٹ ہو گیا تھا..... اب وہ کوئی عام شخص نہیں تھا' دشمن فوج کے عقب میں "ریکی" کرنے والا ہوشیار اور نڈر فوجی افسر تھا..... اس نے عقب میں طائرانہ نگاہ ڈالی' اس کی گاڑی کے عقب میں ایک اور گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے اندازہ لگایا کہ کم از کم تین افراد اس کے تعاقب میں ہیں۔ اس نے صورتِ حال پر غور کیا اور سمجھ گیا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیلا لفافہ واقعی کوئی بہت اہم چیز ہے۔ وہ بغیر رکے چلتا رہا' اب اس نے مکانوں کے نمبر پڑھنے بند کر دیے تھے صرف ان پر نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا' اس کی رفتار بھی پہلے سے کچھ تیز تھی۔ دو گلیاں پار کر کے وہ ایک نسبتاً سنسان گلی میں پہنچا' دن کے قریباً گیارہ بجے تھے' گلی کے آخری سرے پر صرف ایک آئس کریم والا کھڑا تھا' دو ننھے بچے اس سے آئس کریم خرید رہے تھے' مراد کا تعاقب مسلسل جاری تھا۔ تعاقب کرنے والے بھی شاید جان گئے تھے کہ وہ اپنے تعاقب سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اب وہ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب پہنچ رہے تھے' بائیں طرف سفید شلوار قمیض میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ اگر مراد غلطی نہیں کر رہا تھا تو اس کی قمیض کے نیچے ریوالور موجود تھا' مراد نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور سمجھ گیا کہ ان کے ارادے خطرناک ہیں' دفعتاً مراد نے دوڑ لگا دی' سنسان سڑک اس کے بوٹوں کی ایڑیوں سے گونج اٹھی' اس کے ساتھ ہی کچھ اور آوازیں سنائی دیں' تعاقب کرنے والے بھی دوڑ پڑے تھے۔ مراد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیلا کاغذ ایک بڑے لقمے کی طرح منہ میں ٹھونسا اور چبانے لگا۔ آئس کریم کھاتے ہوئے بچوں نے اس کی طرف خوف آمیز حیرت سے دیکھا۔ مراد اب پوری رفتار سے ایک بغلی گلی میں بھاگ رہا تھا۔ اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا' ساتھ ساتھ وہ لفافے کو نگلنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ابھی وہ گاڑی سے کافی دور تھا کہ ایک گلی سے دو اور آدمی نکل کر اس کے سامنے آ گئے' مراد کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئیں تھیں' محاذِ جنگ کا بہادر جنگجو بیدار ہو چکا تھا' اس نے اپنے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے آدمیوں کو دیکھا لیکن رفتار کم نہ کی۔ پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے اس نے ان دو

آدمیوں پر چھلانگ لگا دی اور انہیں بری طرح رگیدتا ہوا کوئی 20 فٹ تک لے گیا' ان دونوں کے سر پختہ سڑک سے ٹکرائے۔ حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ وہ اپنا دفاع کرنے میں بالکل ناکام رہے' ان میں سے ایک بے ہوش ہو چکا تھا جب کہ دوسرے کا سر تیزی سے خون اگل رہا تھا۔ اس وقت عقب میں آنے والے تینوں افراد بھی سر پر پہنچ گئے۔ سفید شلوار قمیض والے کے ہاتھ میں خوفناک پھل کا چاقو تھا جب اس نے چاقو والا ہاتھ گھمایا' مراد اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا' چاقو کا وار خالی گیا اور اس وقت مراد انتہائی تیزی سے اٹھا' اس کے سر کی ضرب مدِمقابل کے سینے پر پسلیوں کے درمیان لگی۔ وہ اچھل کر اپنے ساتھی پر جا گرا' ضرب گو اتنی زوردار نہیں تھی لیکن اتنی برمحل تھی کہ مضروب کے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ زمین پر گرتے ہی لوٹ پوٹ ہونے لگا اور لوٹ پوٹ ہوتا ہوا گلی کے کنارے نالی میں جا گرا۔ مراد نے سوچا اگر اس کے فزیکل ٹریننگ کے انسٹرکٹر یہاں ہوتے تو کندھا تھپتھپا کر کہتے۔ "ویل ڈن' ینگ مین' بالکل نشانے پر ضرب لگائی ہے۔" تیسرا آدمی گرے ہوئے شخص کے اوپر جھکا' وہ اس کی قمیض کے نیچے سے ریوالور نکالنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت مراد کی داہنی ٹانگ اس کی پشت پر پڑی اور اس ٹانگ کی ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ شخص جیسے اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا' مراد نے موقع غنیمت جانا اور مڑ کر پوری رفتار سے کار کی طرف دوڑ لگا دی' اس دھماچوکڑی کے دوران مختلف کوٹھیوں کے دروازے کھل گئے تھے اور کھڑکیوں سے بھی چہرے جھانکنے لگے تھے۔ جب سفید قمیض والے نے مراد پر چاقو کا وار کیا تھا عورتوں اور بچوں کی ملی جلی چیخیں بھی سنائی دی تھیں' اب وہ بھاگتا ہوا کار کی طرف جا رہا تھا' اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور تعاقب کرنے والے اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھے بہتر یہی تھا کہ وہ کار بھگاتا ہوا کسی قریبی تھانے میں لے جاتا' بھاگتے بھاگتے اس نے پتلون کی جیب سے کار کی چابیاں نکالیں' کار کے قریب پہنچتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا' کھڑکی سے اس نے دیکھا تعاقب کرنے والے اندھا دھند اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ اس نے چابی گھما کر کار سٹارٹ کی' گیئر لگایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی کو ایک

سخت جھٹکا لگا اور وہ سڑک پر لہرا گئی۔ گاڑی کے پہیے پنکچر تھے یا کر دیئے گئے تھے لیکن رکنا بہت خطرناک تھا' وہ پنکچر پہیوں کے ساتھ ہی کار کی رفتار بڑھانے لگا' سڑک کے دونوں اطراف لوگ خوفزدہ نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے' مراد تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا کشادہ سڑک پر آیا' اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مختلف گلیوں سے تین چار کاریں نکلیں اور اس کے تعاقب میں لگ گئیں۔ اسے پکڑنے کے انتظامات اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھے ..... لیکن مراد خوفزدہ نہیں تھا ..... جوں جوں وہ خود کو گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا اس کے ذہن پر وحشت سوار ہوتی جا رہی تھی' ابھی وہ بڑی سڑک پر ایک فرلانگ ہی گیا ہو گا کہ پیچھے آنے والی ایک پرانی ٹیوٹا اس کے پہلو پر پہنچی اور دھماکے سے اسے ٹکر ماری۔ مراد کی خوبصورت گاڑی کے دونوں دائیں دروازے چھ چھ انچ اندر گھس گئے کار بری طرح لہرائی' مراد نے بمشکل ایک ریڑھی والے کو بچایا' پھر اس نے دانت کچکچا کر سٹیئرنگ گھمایا اور ٹیوٹا کو دور تک دھکیلتا چلا گیا' ٹیوٹا ایک ٹریفک سگنل سے بچتی ہوئی فٹ پاتھ پار کر گئی اور ایک سرکاری دفتر کی بیرونی دیوار سے جا ٹکرائی' مراد کی ڈاٹسن بھی دھماکے سے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی' کار رکتے ہی مراد تیزی سے باہر نکلا' اس سے پہلے کہ ٹیوٹا سے برآمد ہونے والے تین غنڈے اس کے سر پر پہنچتے وہ گاڑی کی ڈگی سے جیک کا آہنی راڈ نکال چکا تھا' پلک جھپکتے ہی چوک میں ٹریفک کا اژدھام ہو گیا تھا اور مراد کے تینوں مدِمقابل خطرناک انداز سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے' اس وقت اچانک سیٹیوں کی آوازیں آئیں' تھوڑی دور پولیس کا ایک ٹرک کھڑا تھا اور کوئی تیس چالیس سپاہی گھنے درختوں کے نیچے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ "امنِ عامہ" کی بگڑی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر انہوں تاش پھینک کر لاٹھیاں اور بندوقیں سنبھال لیں تھیں اور چوراہے کی طرف اٹھ بھاگے تھے۔ مراد کی طرف بڑھنے والے تینوں آدمیوں نے جب پولیس کو اپنی طرف چارج کرتے دیکھا تو اچانک واپس ٹیوٹا کی طرف بھاگے' ڈرائیور ٹیوٹا کو پہلے ہی ریورس کر چکا تھا' تینوں آدمیوں کے بیٹھتے ہی ٹیوٹا کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے ایک جانب نکل گئی۔

پولیس نے مراد کو حفاظت میں لے لیا' ضابطے کی کارروائی مکمل ہونے میں چند گھنٹے لگ گئے۔ حملہ آوروں کا کوئی ساتھی گرفتار نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال ایک شخص کو مراد نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ شام کوئی چار بجے مراد اپنی خالہ کے ساتھ تھانے سے کوٹھی واپس آ گیا۔ لڑائی میں مراد کی دائیں کہنی پر گہری خراشیں آئی تھیں اور وہاں مسلسل جلن ہو رہی تھی لیکن دل میں بھڑکنے والی آگ کے مقابلے میں یہ جلن کہیں کم تھی' مراد کے سینے میں ایک الاؤ روشن تھا' پیر سائیں اس کے سامنے بے نقاب ہو چکا تھا۔ مراد کا تعاقب کرنے والوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جسے پیر سائیں کا خاص عقیدت مند سمجھا جاتا تھا اس کا نام خدا بخش تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ پیر سائیں کو اس پیلے لفافے سے دلچسپی تھی جو لڑائی کے دوران مراد نے نگل لیا تھا اس لفافے کی خاطر پیر سائیں اس کی ماں کو اذیتیں دیتا رہا تھا اور یہی لفافہ تھا جس کے حصول کے لئے وہ مراد کو ذہنی طور پر مفلوج کر رہا تھا۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچ رہا تھا اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ مسرت کی کہی ہوئی بات ٹھیک تھی' پیر سائیں اچھا آدمی نہیں تھا' وہ ایک بہت بڑا فراڈ تھا ..... یوں لگتا تھا اسے صرف پیلے لفافے سے دلچسپی ہے عین ممکن ہے فوجی کیمپ میں چوری بھی اسی نے کروائی ہو۔ وہ کھدائی سے برآمد ہونے والے سامان میں سے پیلا لفافہ ڈھونڈنا چاہتا ہو لیکن پیلا لفافہ نہ ملنے پر اس نے یہ سامان مراد کے حوالے کر دیا ہو اور رعب یہ گانٹھا ہو کہ یہ سامان اس کی روحانی طاقت کے بل بوتے پر چوری ہونے سے محفوظ رہا۔ مراد کو قبرستان کے بیچوں بیچ پڑا ہوا اپنا جنازہ بھی نہیں بھولا تھا اس رات کا ہر لمحہ اس کے ذہن میں محفوظ تھا' اسے یاد آیا کہ اس رات جب صبح وہ بیدار ہوا تھا تو اس کا سر بہت بھاری تھا' اس وقت بھی اس نے سوچا تھا شاید اسے بے ہوشی کی دوا دی گئی ہے لیکن اب وہ یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اسے بے ہوش کیا گیا تھا۔ اس نے بہت اچھا کیا تھا کہ جو لوہاراں والی سے چلا آیا تھا ورنہ پیر سائیں کے ہتھکنڈے ضرور اسے پاگل کر کے چھوڑتے۔

مراد نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا' برآمدے میں بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں بارش کی چمکتی ہوئی پھواریں صاف دکھائی دے رہی تھیں' اسے اس کمرے میں لیٹے کوئی چھ گھنٹے ہو چلے تھے خالہ آسی اس کے کمرے میں رکھا ہوا ٹیلی فون اٹھا کر باہر لے گئیں اور اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا..... لیکن اب آرام شاید مراد کی قسمت میں نہیں تھا' اصل خراشیں اس کے بازو پر نہیں اس کے دل پر تھیں۔ وہ بستر پر چت لیٹا خیالوں کا تانا بانا بُنتا رہا' جب اسے یقین ہو گیا کہ سب لوگ سو چکے ہیں تو وہ بہ آہستگی بیڈ سے اترا' بغیر کوئی آواز پیدا کئے اس نے کپڑے بدلے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی' دراز سے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکالا اور کھڑکی کھول کر باہر نکل آیا' بارش جاری تھی' وہ مسلح چوکیدار اور ٹینا کے کتے سے بچتا ہوا کوٹھی کے عقب میں چلا آیا پھر اس نے بڑی پھرتی سے عقبی دیوار پھاندی اور سڑک پر آ گیا' کتنی دیر وہ دیوار کے ساتھ کھڑا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر گھنے درختوں کے نیچے چلتا ہوا بڑی سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اسے رکشہ مل گیا' کوئی پونے گھنٹے بعد جب وہ نجف کالونی کے سٹاپ پر اترا اس نے گھڑی دیکھی رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے' وہ پوری طرح مطمئن تھا کہ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا۔

دھیمی بارش کا سلسلہ جاری تھا' وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھنے لگا' اب وہ ایک بار پھر کوٹھیوں کی نیم پلیٹوں پر نظریں دوڑا رہا تھا..... سڑک دور تک سنسان تھی' وہ ایک بغلی سڑک پر تھوڑی دور گیا اور بالآخر مطلوبہ کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا' یہ ایک کافی بڑی کوٹھی تھی لیکن نہایت خستہ حالت میں' لگتا تھا طویل عرصہ سے اس کی مرمت نہیں کرائی گئی۔ لان میں کثرت سے جھاڑ جھنکار اُگا ہوا تھا' پہلی نظر میں تو مراد کو یہ کوٹھی بے آباد لگی لیکن پھر بلند و بالا کار پورچ کے قریب اسے ایک کھڑکی میں مدھم روشنی نظر آئی۔ مراد نے مین گیٹ کے قریب پہنچ کر دیکھا پورچ میں ایک پرانی سی کار بھی کھڑی تھی' اس کا مطلب تھا مکین کوٹھی کے اندر ہی ہیں' اس نے لکڑی کے سال خوردہ گیٹ کے قریب گھنٹی کا بٹن تلاش کیا لیکن ناکامی ہوئی پھر اس نے گیٹ کی زنگ آلود کنڈی کھٹکھٹانی شروع کر دی' دس منٹ کی کوشش کے باوجود کہیں نقل و حرکت کے آثار

دکھائی نہ دیئے' بالآخر مراد نے گیٹ کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا' محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ پورچ میں پہنچا' اندرونی دروازہ بھی دباؤ ڈالتے ہی کھل گیا۔

"کوئی ہے!" اس نے آواز دی' اس کی بھاری بھرکم آواز کوٹھی کی بھول بھلیوں میں گونج کر رہ گئی' چند لمحے انتظار کرنے کے بعد وہ پھر آگے بڑھا جیب تھپتھپا کر اس نے ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کر لیا تھا' کوٹھی کے بلند و بالا کمرے ہر قسم کے فرنیچر اور ساز و سامان سے بے نیاز تھے' رنگ و روغن تو کجا کئی جگہوں پر دیواریں پلستر سے بھی محروم تھیں' آخر وہ ایک روشن کمرے کے سامنے پہنچ گیا دروازہ کھلا تھا' اس نے اندر جھانکا' یہ واحد کمرہ تھا جہاں بود و باش کے آثار پائے جاتے تھے' سنگل بیڈ' چھوٹی سی تپائی۔ ٹیبل لیمپ' چائے کی کیتلی' بیڈ کے سرہانے پرانے ماحول کا ایک بڑا سا ریڈیو پڑا تھا لیکن اس کمرے کی سب سے خاص چیز کتابیں تھیں۔ چھوٹی بڑی' موٹی پتلی' مجلد غیر مجلد ان گنت کتابیں تھیں جو پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھیں۔ "کوئی ہے؟" مراد نے ایک بار پھر کہا اور اس وقت رائفل کی سرد نالی اس کی کنپٹی سے آ لگی۔ پھر اس سے پہلے کہ مراد سمجھتا ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی پتلون کی جیب ریوالور کے وزن سے چھنکارا پا گئی ..... ایک عمر رسیدہ آواز آئی۔

"خبردار' چالاکی نہ دکھانا' سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" مراد نے ہدایت پر عمل کیا' پھر اس کی نگاہ دروازے میں کھڑے شخص پر پڑی' وہ ایک ستر پچھتر سالہ شخص تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک' بڑے بڑے الجھے ہوئے بال۔ خود رو داڑھی اور ڈھیلی ڈھالی سی پتلون' اسے دیکھنے سے کسی فلسفی یا شاعر کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا لیکن اس کی آواز ..... ہاں اس کی آواز بالکل مختلف تھی ..... زندگی اور زندگی کے ولولوں سے بھرپور' وہ لبلبی پر انگلی رکھے بڑے اطمینان سے کسی کاؤ بوائے کی طرح مراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لڑکے! آج صبح بھی تم مجھے تلاش کر رہے تھے پھر کچھ لوگوں سے تمہارا جھگڑا ہوا اور تم ایک شخص کو بے ہوش کر کے بھاگ گئے ..... یہ سب کیا چکر ہے ..... کون

ہو تم.....؟"

مراد نے کھنکار کر گلاف صاف کیا اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے آپ ہی مختار صاحب ہیں۔"

بوڑھا بولا۔ "مختاری تو کسی اور ہستی کو حاصل ہے میاں ..... بہرحال اگر میں ہی مختار ہوں تو تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔"

مراد نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "میں لوہاراں والی سے آیا ہوں محترم بزرگ!"

یہ اطلاع مراد کے میزبان کے لئے بم کا دھماکہ ثابت ہوئی' اس کے منہ میں سگار تھا' ہاتھ بندوق پر تھے اور وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا مراد کو دیکھ رہا تھا.....

"کہیں تم شمشاد تو نہیں.....؟"

"نہیں جناب! میں مراد ہوں۔"

بوڑھے نے بڑی شائستگی سے بندوق دیوار سے لٹکائی' سگار کا ٹکڑا پاؤں تلے مسلا اور آگے بڑھ کر مراد کو گلے لگا لیا۔

"میرے پاس تمہاری ایک امانت ہے بیٹے ..... بہت بڑی امانت ....."

بوڑھے نے مراد کے کان میں جذباتی سرگوشی کی۔

پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا' اس نے مراد کو خود سے جدا کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"اگر تم واقعی شفیع کے بیٹے مراد ہو تو ..... تو پھر یہاں رکنا ٹھیک نہیں' تمہاری زندگی خطرے میں ہے چلو آؤ میرے ساتھ۔"

بوڑھے نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا' مراد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن بوڑھے کے تاثرات دیکھ کر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی' بوڑھا اسے تقریباً بھگاتا ہوا اپنی کھٹارہ کار تک لے آیا۔

بوڑھا اس کھٹارہ کار کو بڑی مہارت سے چلاتا ہوا مضافات میں لے آیا۔ ایک جگہ سڑک سے ہٹ کر درختوں کے قریب اس نے کار کھڑی کی' کار کی اندرونی بتی جلا کر وہ

غور سے مراد کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے اس کے خدوخال میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر اس نے کار کا انجن بند کر کے تمام بتیاں بجھا دیں اور مراد کو ایک کہانی سنانے لگا۔

اس نے کہا۔ "نوجوان! میں اور تیرا باپ شفیع محمد گہرے دوست تھے' وہ کھیتی باڑی کرتا تھا' میرے باپ کی گاؤں میں لوہار کی دکان تھی یہ آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دکان پر باپ کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں کوئی بڑا آدمی بنوں۔ میں بڑا آدمی تو نہ بن سکا لیکن بڑا ضرور ہو گیا اور بڑا ہو کر شہر میں پڑھنے چلا آیا۔ یہاں میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور یہیں پریکٹس کرنے لگا لیکن گاؤں اور اپنی مٹی سے میرا رشتہ برقرار رہا۔ میں فرصت ملتے ہی گاؤں جاتا اور ایک وکیل سے لوہار بن جاتا' اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا' کھیتوں میں تمہارے باپ شفیع محمد کے ساتھ گھومتا' جوہڑوں میں تیرتا اور گاؤں کے کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ شفیع محمد کی شادی ہو چکی تھی لیکن کوئی اولاد نہیں تھی۔ میری شادی ہو چکی تھی اور ایک بچہ بھی تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ شادی کے بیس سال بعد شفیع محمد باپ بن گیا اور میں اولاد سے محروم ہو گیا۔ میری بیوی اور دو بچے ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ صدمہ شدید تھا لیکن بتدریج زندگی معمول پر آ گئی۔ میں لاہور منتقل ہو گیا اور والدین کو بھی وہیں بلا لیا لیکن میں اکثر گاؤں جاتا تھا۔ تم اور تمہارا بھائی شمشاد اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ آدھی رات کے وقت شفیع محمد ایک وزنی گٹھڑی اٹھائے میرے گھر آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا' اس نے کہا۔

"مختار! یہ گٹھڑی لے کر صبح سویرے گاؤں سے نکل جاؤ ..... یہ تمہارے پاس میری امانت ہے اور میں اسے وصول کروں گا' مجھے دیر ہو سکتی ہے لیکن میں آؤں گا ضرور۔"

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا' اس نے کہا۔ "اگلی ملاقات میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

شفیع کے کہنے کے مطابق میں علی الصبح گٹھڑی کے ساتھ شہر روانہ ہو گیا۔ سبزیوں

سے لدا ہوا ایک چھکڑا شہر جا رہا تھا۔ میں نے گٹھڑی اس پر لادی اور بس اڈے پر جا پہنچا۔ وہاں سے میں لاہور آ گیا۔ گٹھڑی غیر معمولی طور پر وزنی تھی' گھر جا کر میں نے اسے کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ..... میرے سامنے طلائی زیورات کا ڈھیر پڑا تھا' یہ زیورات مختلف اقسام اور سائز کے تھے لیکن آج سے بیس سال پہلے بھی ان کی قیمت 15 لاکھ سے کم نہیں تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ شفیع محمد کو اتنی دولت کہاں سے اور کیسے ملی۔ وہ میرا دوست تھا اور اس سے بڑھ کر مجھے کوئی شے عزیز نہیں تھی۔ اس لئے مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت تھی۔ میں نے یہ تمام سونا اپنے پاس محفوظ کر لیا اور لوہاراں والی شفیع محمد کو خط لکھا کہ میں تمہاری امانت حفاظت سے لے آیا ہوں اب تم جلد از جلد شہر پہنچو اور بتاؤ اس کا کیا کرنا ہے لیکن پھر چند روز بعد 65ء کی پاک بھارت جنگ چھڑ گئی وہ علاقہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا' رابطے منقطع ہو گئے۔ میں نے شفیع محمد کو اس کے رشتے داروں میں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کو اس کے گھرانے کا پتہ نہیں تھا۔ تلاش بسیار کے بعد میں صرف تمہاری والدہ کو ڈھونڈ سکا۔ ان دنوں اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں اکیلی ٹھہری ہوئی تھی۔ تم سب لوگ اس سے بچھڑ چکے تھے میں نے ہر ممکن اس کی مدد کی۔ بعدازاں وہ اپنے دیہی گھر واپس چلی گئی۔ تمہیں اور تمہارے باپ کو ڈھونڈنے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر مایوس ہو کر میں نے تلاش ترک کر دی' لیکن مجھے یقین تھا کہ اپنے وعدے کے مطابق شفیع محمد ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔ اس کی امانت میں نے اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی اور ..... وہ اب بھی محفوظ ہے۔"

مراد پوری توجہ سے بوڑھے کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر وہ بولا "محترم بزرگ! آپ نے میرے والد صاحب کو جو خط بھیجا تھا شاید وہی خط مجھے آپ تک پہنچانے کا سبب بنا ہے' آپ نے خط کے لفافے پر اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا۔"

"ہاں' ہاں!" بوڑھا سر ہلاتا ہوا بولا۔ "تمہارے باپ کو معلوم نہیں تھا کہ لاہور میں میری رہائش کہاں ہے۔ میں نے لفافے پر اپنا پتہ لکھا تھا' تمہیں یہ خط کہاں سے

ملا..... لیکن ٹھہرو! تم مجھے تفصیل سے اپنی کہانی سناؤ ایک عرصہ ہوا میں گاؤں نہیں جا سکا' مجھے وہاں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں۔"

مراد نے مختصراً تمام حالات سنائے اور بتایا کہ اس کے والد اور بھائی کا تاحال کوئی پتہ نہیں' پھر اس نے بتایا کہ کس طرح مورچوں کی کھدائی کے دوران اسے کچھ پرانی نشانیوں کے ساتھ وہ پرانا لفافہ ملا اور اس پر لکھے ہوئے ایڈریس کے ذریعے وہ یہاں تک پہنچ گیا۔ بوڑھا اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا' پھر اس نے پوچھا۔

"نوجوان! لگتا ہے کہ تمہارے پیچھے کچھ غنڈے ہیں۔ کل تمہارا جھگڑا کیسے ہوا تھا؟"

مراد نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو تایا جان کہہ لوں۔ تو تایا جان! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کچھ لوگ اس پیلے لفافے کے ذریعے آپ تک پہنچنے کے خواہاں ہیں' شاید اسی امانت کے لئے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے ..... کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہیں؟"

اس دوران مراد بوڑھے پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا' اس نے اسے پیر سائیں کے متعلق بتایا' پیر سائیں کا نام سن کر بوڑھا چونکا' اس نے کہا:

"مراد بیٹے! میں اس شخص کے متعلق ہمیشہ مشکوک رہا ہوں' لوہاراں والی کے باشندوں پر اس کا بہت اثر ہے لیکن میں اسے ایک فراڈ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔"

مراد دیکھ رہا تھا کہ بوڑھے مختار اور اس کے خیالات میں کافی ہم آہنگی پائی جاتی ہے' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"جناب! اب پیر سائیں کا فراڈ اور نہیں چل سکے گا' آج رات کی صبح پیر سائیں کا یوم حساب ثابت ہو گی۔"

اس کے لہجے کی گھن گرج نے بوڑھے مختار کو اپنے جگری یار شفیع کی یاد دلا دی۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا کہ اب اس "پُراسرار" امانت کا عقدہ کھلنے کو ہے جو

بیس برس سے اس کی کوٹھی کے ایک تاریک کونے میں پڑی تھی۔

☆==========☆==========☆

پولیس کی جیپیں دندناتی ہوئی گاؤں میں داخل ہوئیں اور پیر سائیں کے سبز دروازے کے سامنے ٹھہر گئیں۔ ایک جیپ سے کیپٹن مراد اور ملک مختار اترے اور دوسری جیپ سے ایک ایس پی مسلح عملے کے ساتھ برآمد ہوا۔ پلک جھپکتے میں پیر سائیں کے ڈیرے کو گھیر لیا گیا۔ ایس پی صاحب کے ہاتھ میں پستول تھا انہوں نے دھکا دے کر سبز دروازے کو کھولا سامنے پیر سائیں کے دو باریش مرید کھڑے تھے۔ ایس پی صاحب نے آگے بڑھنا چاہا تو مریدوں نے حیرت انگیز جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں روک دیا۔

"آپ اندر نہیں آسکتے۔" ایک مرید کڑے لہجے میں بولا۔

مراد تیزی سے آگے بڑھا اس نے مرید کو دھکا دیا وہ لڑھکتا ہوا پختہ فرش پر جا گرا۔ مراد اور ایس پی اندر داخل ہوئے' اندرونی دروازہ کھول کر وہ اس کمرے میں آئے جہاں پیر سائیں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ مراقبے کی حالت میں بیٹھا رہتا تھا لیکن اس وقت کمرے میں صرف چند آدمی نظر آ رہے تھے' پیر سائیں اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ ایس پی صاحب نے گرج کر کہا۔ "پچھلے کمرے میں جو کوئی بھی ہے باہر نکل آئے"۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے گھوم کر دیکھا اور انگلی کے اشارے سے ایس پی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا' اس کا انداز ایسا تھا جیسے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کی بجائے نادان بچے کو چپ کرا رہا ہو۔ مراد تلملا کر آگے بڑھا اور گرجا۔

"کھڑے ہو جاؤ تم سب ..... اور بتاؤ کہاں ہے پیر سائیں!"

کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے سر پر اوڑھی ہوئی چادر ہٹائی اور گھوم کر ان کی طرف دیکھا' اسے دیکھتے ہی ایس پی صاحب کا پستول خود بخود جھک گیا' وہ بے اختیار اٹین شین ہو کر پوزیشن میں ہو گئے۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور متانت سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایس پی صاحب کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے گئے' مراد بھی باہر نکل آیا۔ وہ شخص ایک کونے میں کھڑا ایس پی صاحب سے کچھ

کہہ رہا تھا۔ چند لمحے بعد ایس پی صاحب ملک مختار اور مراد کے پاس آئے اور پشیمانی سے کہنے لگے۔

"میں آپ دونوں کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔"

مراد اور ملک مختار کی رہائی اگلے روز پیر سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ انہیں گرفتار کروانے والا حکومت کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا۔ اپنی ضمانت کے سلسلے میں مراد اور ملک مختار کو جو دشواریاں پیش آئیں ان سے انہیں پیر سائیں کے وسیع تعلقات کا تھوڑا سا اندازہ ہوا۔ مراد سخت غضب ناک تھا۔ شاید اگر اس کے ساتھ ملک مختار نہ ہوتا تو وہ قانون شکنی پر مائل ہو جاتا اور اگر "سرحد کا محافظ" قانون شکنی پر اتر آتا تو سب سے پہلے پیر سائیں کے ٹکڑے کرتا جو اس کی پاک سرزمین پر گہری جڑوں والے زہریلے درخت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے سینے میں ایک آگ بھڑک رہی تھی جس کے شعلے لحہ بہ لحہ بلند ہوتے جا رہے تھے۔ ملک مختار وقفے وقفے سے اس آگ پر نصیحتوں اور مشوروں کے چھینٹے دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ آگ کسی بھی لمحے قابو سے باہر ہو سکتی ہے۔ تھانے سے سیدھے دونوں لوہاراں والی پہنچے' ماں نے آگے بڑھ کر بلائیں لیں۔ خالہ آسی اور ٹینا بھی شہر سے اس کی گرفتاری کی خبر سن کر وہاں پہنچ گئی تھیں' ریاست نے بتایا کہ سارے گاؤں میں اس کی گرفتاری کا چرچا ہے۔

ملک مختار ایک دلچسپ شخصیت کا مالک بوڑھا تھا' پریشان کن حالات کے باوجود اس کی خوش گفتاری برقرار تھی' مراد کو اس کی موجودگی میں بہت حوصلہ ہو رہا تھا۔ دونوں بالائی کمرے میں بیٹھے صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے ٹینا کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی خالہ آسی برآمدے میں اس کی ماں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ ملک مختار' خالہ آسی اور ٹینا کی آمد سے یہ تنہا مکان ایک بھرے گھر میں تبدیل ہو گیا۔ خالہ آسی اور ملک مختار کی کاریں گلی میں کھڑی تھیں۔ گاؤں کے بچے دور دور کھڑے ان گاڑیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ دروازے پر بندھا ہوا ٹینا کا کتا جو اس کے ساتھ ہی آیا تھا بھونک بھونک کر انہیں نزدیک آنے کے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا۔

ملک مختار، مراد سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو مراد! ہمیں نقار خانے کا طوطی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیں "طوطی" بننا ہی نہیں چاہئے، ہمیں کوئی عملی کام کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ پیر سائیں فراڈ ہے لیکن اس فراڈ کو ثبوت کی ضرورت ہے۔"

"لیکن ثبوت کیسے فراہم ہو گا؟" مراد نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"ہاں! یہی بات سوچنے کی ہے۔" بوڑھا ملک مختار مسکرایا۔

لیکن وہ سوچ بچار کا آغاز نہ کر سکے۔ دفعتاً گلی سے چیخ و پکار کی آواز آئی۔ مراد نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا، آوازیں مسرت کے صحن سے آ رہی تھیں، اس نے حیرانگی سے دیکھا ریاست صحن میں کھڑا مسرت کو مار رہا ہے، مسرت کی ماں اور ایک چھوٹا بچہ بلند آواز میں چیخ رہے تھے۔ مراد بھاگتا ہوا صحن میں آیا اور گلی سے ہوتا ہوا مسرت کے دروازے پر جا پہنچا، اس نے زور سے دستک دی، پھر بے تابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، ریاست اس وقت ایک موٹی لکڑی اٹھائے مسرت کی طرف لپک رہا تھا، اس نے جھپٹ کر اسے تھام لیا، بمشکل کھینچتا ہوا وہ اسے دروازے تک لایا، پھر سنبھالتا ہوا باہر لے آیا، ریاست مسلسل چیخ رہا تھا۔ "حرامزادی، میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا..... جان سے مار دوں گا۔" گلی کے کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

مراد غصے سے بولا۔ "ریاست، اس طرح لوگوں کو تماشا نہ دکھاؤ..... چلو میرے ساتھ۔" پھر وہ اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے گھر تک کھینچ لایا۔ آسی اور ٹینا سیڑھیوں میں کھڑی حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ جس ماحول میں رہتی تھیں وہاں ایسے "گھمسان" کے مناظر کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ ٹینا آنکھیں جھپک جھپک کر اس بپھرے ہوئے شوہر کا موازنہ شاید فلمی شوہروں سے کر رہی تھی۔

مراد اسے لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلا گیا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریاست جیسا پڑھا لکھا اور مذہبی شخص اس طرح غصے سے مغلوب ہو سکتا ہے، مسائل حل کرنے کا یہ طریقہ نہایت بھونڈا تھا، بمشکل وہ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوا۔ میاں بیوی کے جھگڑے پر ایک دفعہ پہلے بات ہوئی تھی اب مراد اس بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتا

تھا..... کافی کوشش کے بعد ہی مراد کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو سکا۔ ریاست کی باتوں سے پتہ چلا کہ میاں بیوی میں گہری محبت تھی۔ بچہ نہیں تھا لیکن اسے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی، زندگی اچھی گزر رہی تھی، کوئی نو ماہ پہلے ایکا ایکی مسرت کا رویہ بدلنا شروع ہوا۔ وہ ریاست سے دور دور رہنے لگی، ہر وقت کھوئی کھوئی، غیر حاضر اور اجڑی پجڑی رہتی۔ ایک دن ساس کہہ بیٹھی، ابھی تیری شادی کو دو سال بھی نہیں ہوئے اور تُو بڑی بوڑھیوں کی طرح رہنے لگی ہے، کچھ سنگھار کیا کر شوہر کو خوش رکھا کر اس طرح دل دور ہو جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات پر ساس بہو میں جھگڑا ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے سنگین صورت اختیار کر گیا، نتیجے میں وہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔ ریاست سمجھتا تھا کہ کچھ عرصے میں ٹھیک ہو جائے گی لیکن اب چھ سات مہینے ہو چکے ہیں وہ واپس نہیں آئی تھی، اس نے ایک بیمار بچہ گود لے لیا تھا سارا دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ لگتا تھا وہ بھول چکی ہے کہ کبھی اس کی شادی ہوئی تھی، ریاست ایک دو دفعہ گیا لیکن وہ بدستور کھچی کھچی رہی تھی۔ آج وہ کوئی فیصلہ کرنے گیا تھا اس نے مسرت سے پوچھا کہ وہ اس کے گھر میں رہنا چاہتی ہے یا نہیں۔ مسرت نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آنسو بہاتی رہی، ریاست کو طیش آ گیا اور اس نے زندگی میں پہلی بار اسے پیٹ ڈالا۔

مراد نے بڑی توجہ سے ریاست کی ساری باتیں سنیں، پھر اس نے کہا۔ "ریاست! مسرت اور اس کی ماں مجھے بچپن سے جانتی ہیں، میرا خیال ہے مجھے ان سے بات کرنی چاہئے۔ میں آج ہی ان کے ہاں جاتا ہوں۔"

اس روز شام کے وقت مراد مسرت کے گھر داخل ہوا۔ اتفاقاً اس کی ماں موجود نہیں تھی مسرت کمرے میں بیٹھی دو ڈھائی برس کے ایک نہایت نحیف بچے کو پنکھا جھل رہی تھی۔ صبح کے المناک واقعے کی رنجیدگی ابھی تک اس کے چہرے سے ظاہر تھی، آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے اور خوبصورت رخسار پر شوہر کی لگائی ہوئی چوٹ کا سرخ نشان موجود تھا، مراد نے سلام کر کے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا، پھر ایک موڑھا گھسیٹ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ پنکھا جھلتی ہوئی یہ اداس لڑکی اسے بڑی بھلی لگی، ایک

لمحے کے لئے' صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ کاش اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ریاست کا دوست بن کر سوچ رہا تھا' وہ اس سے باتیں کرنے لگا' بچے کے متعلق مسرت نے بتایا کہ یہ ایک غریب عورت کا بچہ ہے جو اسے بیمار چھوڑ کر مر گئی ہے اب وہ اس کی نگہداشت کرتی ہے' اس نے بتایا کہ بچے کو کئی حکیموں نے دیکھا ہے دم درود بھی کروایا ہے' دراصل اس پر کسی نے تعویذ کر رکھے ہیں' دن بدن سوکھتا جا رہا ہے۔

مراد نے موضوع بدلا اور مسرت سے اس کی گھریلو زندگی کے اور موجودہ صورت حال کے متعلق باتیں کرنے لگا' مسرت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی' پھر ایکا ایکی وہ جذباتی ہو گئی' اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے وہ چیخ پڑی۔

"مراد! خدا کے لئے بس کرو یہ نصیحتیں' میں یہ باتیں سن سن کر پاگل ہو جاؤں گی' چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔"

مراد اس کے تلخ رویے پر بھونچکا رہ گیا نہایت آزردگی کے ساتھ معذرت کر کے وہ کھڑا ہو گیا' تب مسرت نے اپنا رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا' مراد کی آنکھوں میں رنج و الم کے سائے لہرا رہے تھے' اسے وہ چھوٹا سا لڑکا یاد آ گیا جس کے ساتھ وہ کھیت کھیت اور گلی گلی گھوما کرتی تھی' جس کے ساتھ وہ ہنستی اور جس کے ساتھ روتی تھی۔ جو اس کا ہمجولی اور ہمراز تھا۔ اسے وہ چھوٹی چھوٹی بات بتاتی اور اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں سنتی تھی لیکن آج اس نے بے دردی سے اس کا مان توڑ دیا تھا' وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے معاف کرنا مراد! میں اپنے ہوش میں نہیں' بیٹھ جاؤ۔ خدا کے لئے بیٹھ جاؤ۔"

مراد بہ آہستگی بیٹھ گیا۔ مسرت نے آنسوؤں' ہچکیوں اور آہوں کے درمیان اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ اس گٹھڑی کے اندر سے ایک اجنبی سی آواز سنائی دی ..... یہ اس عورت کی آواز تھی جو صدیوں سے ظلم سہہ رہی تھی ..... جو ہر دور اور تمدن کی معتوب تھی ..... مراد اس آواز کو پہچانتا تھا جب کسی عدالت کے کٹہرے میں کسی نوجوان عورت کو کھڑا کر کے پوچھا جاتا ہے' بتاؤ تم سے کس نے زیادتی کی ہے' کیوں کی اور

کیسے کی؟ تو جواب میں ایسی ہی ناقابلِ شناخت' شکست خوردہ اور پشیمان آواز سنائی دیتی ہے ..... ہاں مسرت اس آواز میں بول رہی تھی' وہ کہہ رہی تھی۔

"مراد ..... میں اپنے شوہر کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکی ..... میں پاک دامن بیوی نہیں رہی ..... میں اس نیک شخص کے قابل نہیں ..... لٹ چکی ہوں' برباد ہو چکی ہوں....."

مراد کے ذہن میں جیسے کسی نے چپکے سے بارودی سرنگوں کے سلسلے پر پاؤں رکھ دیا تھا' اس کا کاسۂ سر دھماکوں سے گونج اٹھا' وہ لرزاں لہجے میں بولا۔

"مسرت مجھے بتا' کون کھیلا ہے تیری عزت سے' میں اس کی زندگی حرام کر دوں گا۔"

مسرت کی سسکی سنائی دی۔ "تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا مراد ..... اس گاؤں میں کسی نے اسے نہیں دیکھا' وہ انسان نہیں شیطان ہے ..... ایک بدروح ہے۔"

مکان سے باہر گلی میں ٹینا کا کتا عجیب وحشیانہ انداز میں بھونک رہا تھا ..... نہ جانے کیوں؟

مراد اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ مسرت کا مسئلہ کیا ہے۔ وہ احساسِ گناہ کا شکار تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ پاکباز بیوی نہیں رہی' یہ احساس اس لئے اور بھی شدید تھا کہ دونوں میاں بیوی ازدواجی رشتے کے ساتھ محبت کے رشتے میں بھی منسلک تھے۔ اب مسرت میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے محبوب خاوند سے نگاہیں ملا سکے۔ یہی وجہ تھی جو وہ اس سے کھچی کھچی رہتی تھی۔ اب یہ کھچاؤ اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

نادان لڑکی یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ جو کچھ ہوا حادثاتی طور پر ہوا۔ اس میں اس کی اپنی مرضی شامل نہیں تھی اس نے اس واقعے کو بری طرح ذہن پر سوار کر لیا تھا۔ مراد نے فیصلہ کیا کہ وہ مسرت کے ذہن کو اس حادثے کے اثر سے نکالنے کی کوشش کرے گا لیکن یہ فوراً ہونے والا کام نہیں تھا' اس کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

مراد قریباً آدھ گھنٹہ مسرت کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کا موضوع گفتگو یہی حادثہ تھا۔ مراد کے کئی بار پوچھنے کے باوجود مسرت نے کچھ نہیں بتایا کہ اس واقعے کے ذمے دار کون شخص یا اشخاص ہیں۔ وہ بس یہی کہتی رہی۔

"تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے' اگر میں بتا دوں تو بھی تم اس تک نہ پہنچ پاؤ گے۔"

آخری دفعہ جب اس نے یہ بات کہی تو اس کا لہجہ اس قدر فیصلہ کن تھا کہ مراد نے مزید زور ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگا کہ مسئلے کا حل یہ نہیں کہ وہ اپنے خاوند سے دور ہٹ جائے' مسئلے کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے شریکِ حیات کو اپنے دکھ میں شریک کرے۔ اگر اس کے ذہن پر اس واقعہ کا کوئی بوجھ ہے تو وہ شوہر کو صاف صاف ساری بات بتا دے' وہ پڑھا لکھا نیک شخص ہے' کبھی اسے قصور وار نہیں ٹھہرائے گا۔

گفتگو کے اختتام پر جب وہ مسرت کے پاس سے اٹھا' وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

☆==========☆==========☆

ملک مختار اور مراد ایک ہی کمرے میں اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ چھوٹی تپائی پر لالٹین روشن تھی۔ ساتھ والے کمرے میں خالہ آسی اور مراد کی والدہ سو رہی تھیں۔ ٹینا علیحدہ کمرے میں تھی۔ مراد کی والدہ نے کہا بھی کہ وہ ان کے ساتھ سو رہے لیکن اسے الگ کمرے میں سونے کی عادت تھی۔ مراد نے ازراہِ مذاق کہا۔

"ٹینا یہ گھر ایک عرصے سے جنوں بھوتوں کے مسکن کے طور پر مشہور ہے۔"

ملک مختار نے ہنس کر بزرگانہ انداز میں کہا۔ "یہ خود بھی تو کسی بھتنی سے کم نہیں۔"

ٹینا برجستہ بولی۔ "میں نے بھی آپ کو کسی ڈراؤنی فلم کے پوسٹر میں دیکھا ہے' ویسے ملک صاحب آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرے جسم میں وہ غدود ہی نہیں جو ڈر

پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا میں ڈرنا جانتی ہی نہیں۔"

اس سے پہلے کہ ملک صاحب اور ٹینا میں اس بات پر بحث شروع ہوتی کہ "خوف" غدود پیدا کرتی ہیں یا ذہن ..... خالہ آسی نے پکار کر کہا کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ اب وہ سو جائیں۔ ٹینا پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ جب ایک چیخ سنائی دی اور ٹینا اپنا بستر بغل میں دبائے' بال بکھرائے' پریشان حال برآمدے میں نظر آئی' مراد اور ملک مختار تو پہلے ہی جاگ رہے تھے۔ باقی گھر والے بھی جاگ گئے۔ ٹینا نے بتایا کہ اس نے کمرے کی دیوار پر ایک سایہ چلتے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں' خالہ آسی نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"میری بے وقوف بچی ..... تجھے کہا بھی تھا اس کمرے میں لیٹ رہ۔ مراد نے تجھے خواہ مخواہ ڈرا دیا۔"

ٹینا اس قدر ڈر گئی تھی کہ اسے اب علیحدہ کمرہ تو کیا علیحدہ چارپائی پر سونا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ ماں کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ ملک مختار اور مراد اس کی غدودوں والی بات پر دل ہی دل میں مسکراتے کمرے میں واپس آ گئے۔ گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

ملک مختار کا خیال تھا کہ پیر سائیں کے چہرے سے نقاب نوچنے کے لئے اس کے ماضی کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا۔

"مراد' میرے علم کے مطابق یہ آج سے کوئی آٹھ برس پہلے کی بات ہے جب پیر سائیں کو پہلی مرتبہ گاؤں میں دیکھا گیا۔ وہ خاموشی سے ایک چوراہے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر ململ کی ایک دھجی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چند روز وہ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ لوگ اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ گاؤں کے چند افراد نے بتایا کہ انہیں ایک ہی خواب آیا ہے۔ اس خواب میں کسی نے انہیں بتایا تھا کہ مزار گلو شاہ کا اصل گدی نشین گاؤں میں پہنچ گیا ہے۔ لوگوں کا دھیان فوراً پیر سائیں کی

طرف گیا۔ انہوں نے پیر سائیں کو تزک و احتشام کے ساتھ مزار میں پہنچا دیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ پیر سائیں کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کیسے آیا؟ اس کے مریدوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت بھی پُراسرار ہوتی چلی گئی' یہ بات عام مشہور ہے کہ اس کی موجودگی میں بلند آواز سے بولنے والے پر مصیبت نازل ہوتی ہے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ پیر سائیں کی مجلس میں بڑے بااثر اور اہم افراد آکر بیٹھتے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "ملک صاحب! ممکن ہے ماضی میں پیر سائیں اور میرے والد میں کوئی تعلق رہا ہو۔"

"بالکل ممکن ہے۔" ملک مختار نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "آخر کیا وجہ ہے کہ پیر سائیں اس خط کی کھوج میں تمہاری والدہ پر ظلم کے پہاڑ توڑتا رہا۔ ظاہر ہے وہ شفیع محمد کی چھوڑی ہوئی دولت کی تلاش میں ہے۔"

دولت کا ذکر ہوا تو بات اس سونے کی چل نکلی ملک مختار نے ابھی تک مراد کو نہیں بتایا تھا کہ اس کے والد کی امانت اس نے کہاں محفوظ کر رکھی ہے۔ مراد نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ظاہر ہے اگر ملک مختار نے نہیں بتایا تھا تو اس کی کوئی وجہ رہی ہو گی۔ ویسے وہ ان چند دنوں میں ملک مختار پر مکمل اعتماد کرنے لگا تھا۔ رات گئے جب دونوں سونے کے لئے لیٹے تو وہ اس فیصلے پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں پیر سائیں کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔

اگلی صبح کا آغاز کچھ عجیب طرح ہوا۔ مراد بستر سے اٹھا۔ ایک دو جمائیاں لے کر اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ گاؤں کے کچے گھروندوں پر ملگجا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ ابھی سو رہے تھے۔ مراد رات دیر سے سویا تھا لیکن پھر بھی صبح ہی صبح آنکھ کھل گئی۔ نہ جانے کیوں؟ شاید یہ اس مرغ کی وجہ سے ہوا تھا جو عین اس کی کھڑکی کے سامنے حلق کی پوری قوت سے اذانیں دے رہا تھا۔ مراد نے ایک اچٹتی سی نگاہ مسرت کے گھر پر ڈالی اور چونک گیا۔ مسرت صبح صبح گھر کے صحن میں گھوم رہی تھی' انداز چہل قدمی کا تھا' اور

چہرہ گہری سوچ میں گم۔ مراد فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ کل کی نشست رائیگاں نہیں گئی۔ اسی گفتگو کے نتیجے میں مسرت کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔

قریباً دس بجے وہ بچے کی خیریت دریافت کرنے مسرت کے گھر پہنچا۔ وہ کل کی طرح کمرے میں بیٹھی لاغر بچے کو پنکھا جھل رہی تھی۔ مراد نے اسے بتایا تھا کہ بچے پر تعویذوں وغیرہ کا کوئی اثر نہیں اسے کھانسی اور بخار ہے۔ اس نے مسرت سے کہا تھا کہ وہ ایک آدھ دن میں خود اسے شہر لے جائے گا۔ وقتی فائدے کے لئے اس نے بچے کو بخار کی گولیاں دی تھیں۔

مسرت نے بتایا تھا کہ رات وہ بڑے آرام سے سویا رہا ہے۔

مراد بولا۔ "لیکن لگتا ہے تم پھر بھی جاگتی رہی ہو۔"

مسرت کا چہرہ گہری سنجیدگی کے پردے میں اوجھل ہو گیا وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "مراد تم نے جو کہا ہے' میں ویسا ہی کروں گی۔ میں ریاست کو سب کچھ بتا دوں گی۔ خاموشی کا یہ دکھ مجھ سے اور نہیں جھیلا جاتا۔"

مراد کو امید نہیں تھی کہ مسرت اتنی جلدی اس کی بات مان جائے گی' اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ وہ بولا۔ "مسرت! تمہارے سب دکھ دور ہو جائیں گے ..... کیونکہ یہی راستہ ہے جس پر چل کر تم اپنے گھر کو برباد ہونے سے بچا سکتی ہو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کچھ نہیں ہو گا' ریاست اچھے برے اور غلط صحیح کی تمیز رکھتا ہے ..... وہ تمہیں کوئی الزام نہیں دے گا۔"

مسرت نے سر جھکا کر آنسو پونچھے اور بولی۔ "لیکن اگر اس نے وہی سوال کیا' جو تم نے کیا تھا تو پھر؟"

مراد بولا۔ "تمہارا مطلب ہے اگر اس نے پوچھا کہ مجرم کون ہے اور وہ اس سے انتقام لینے پر اتر آیا تو کیا ہو گا ..... مسرت میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ جہاں تک میں نے ریاست کو سمجھا ہے' وہ ایک تعلیم یافتہ اور معقول آدمی ہے وہ تم سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں پوچھے گا جو تم اسے نہ بتانا چاہو اور اگر تمہیں خدشہ ہے کہ

وہ ایسا کرے گا تو تم اسے پہلے سے پابند کر سکتی ہو۔"

مسرت کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں مسہری پر لیٹا ہوا بچہ اپنی سفید سفید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا' جیسے وہ بھی مراد کی تائید کر رہا ہو۔ طویل بیماری کی وجہ سے بچے کا رنگ روپ ختم ہو گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے مراد کو کیوں لگتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

☆==========☆==========☆

شام سے کچھ دیر پہلے مراد خالہ آسی' ملک مختار اور ثینا کو گاؤں میں گھما پھرا کر واپس آیا تو ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ جونہی ملک مختار کی کھٹارہ کار ان کے گھر کے سامنے رکی' ریاست کا بوڑھا باپ بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا۔

"مراد پتر' ریاست نے کچھ کھالیا ہے۔ جلدی کچھ کرو ورنہ وہ بچے گا نہیں۔"

اس کا لہجہ اس قدر سنگین تھا کہ مراد کا دل دہل گیا۔ وہ فوراً کار سے اترا اور بھاگتا ہوا ریاست کے گھر داخل ہوا۔ ریاست بے سُدھ چارپائی پر پڑا تھا۔ محلے کی عورتیں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ ریاست کی بہن بلقیس اس کے پاؤں کے تلوے مل رہی تھی' چاچی برکتے زار و قطار رو رہی تھی۔ مراد نے عورتوں کو پیچھے ہٹایا اور ریاست کو گود میں بھر کر کار تک لے آیا۔ ملک مختار نے کار سٹارٹ ہی رکھی تھی۔ مراد نے ریاست کو پچھلی نشست پر لٹایا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا ذرا دیر بعد کار تیز رفتاری سے شیخوپورہ کی طرف جا رہی تھی۔ شیخوپورہ ہسپتال پہنچتے ہی ریاست کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس نے کوئی ایسی چیز نہیں کھائی۔ وہ کسی صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔

رات گئے ملک مختار اور مراد اسے کار میں ڈال کر گاؤں واپس لے آئے۔ اس کی حالت اب بالکل درست تھی لیکن چہرہ گہرا زرد تھا اور اس نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ مراد کو شک تھا کہ اس کی یہ حالت مسرت سے ملنے کے بعد ہوئی ہے۔ شاید اسے مسرت سے ہونے والی زیادتی کا سن کر صدمہ پہنچا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کی حالت سے مسرت سے اس کی محبت کا ثبوت ملتا تھا۔

اگلے روز دوپہر تک مراد کی یہ خوش فہمی برقرار رہی یہاں تک کہ ریاست اسے

اپنے گھر میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس وقت ٹینا صحن میں بیٹھی اپنے کتے کو گوشت کھلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کتا بدستور بیمار تھا اور اس کا اندازہ اس کی عجیب غراہٹ سے بھی ہوتا تھا۔ ریاست کو دیکھ کر کتا زور سے بھونکا۔ ٹینا نے اسے پچکارا۔ ریاست سست قدموں سے چلتا مراد کے پاس چلا آیا۔ مراد نے اس کی خیریت دریافت کی۔ حال احوال بتانے کے بعد ریاست کی زبان سے جو پہلا فقرہ ادا ہوا مراد کو اس کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ چند لمحے کے لئے تو اس کا ذہن سُن ہو گیا۔ ریاست نے کہا تھا۔

"مراد، میں مسرت کو طلاق دے رہا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو ریاست۔" مراد پکارا۔ "مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔"

ریاست نے پناہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں مراد سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔" پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "مراد، میں نے ایک پاک دامن لڑکی سے شادی کی تھی۔ غلاظت کی گٹھڑی کو اپنے گھر رکھنے کا عہد نہیں کیا تھا۔ ایک آبرو باختہ عورت میرے بچوں کی ماں نہیں بن سکتی ..... کبھی نہیں۔"

"کون کہتا ہے، وہ غلیظ اور آبرو باختہ ہے۔" مراد نے غصے سے پوچھا۔

"وہ غلیظ ہے مراد!" ریاست نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "وہ غلیظ ہے۔"

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ریاست اور مسرت کی ملاقات ہو چکی ہے اور مسرت نے اسے اپنے پر بیتنے والی تمام کہانی سنا دی ہے لیکن اس کہانی کو سن کر ریاست کا طلاق پر آمادہ ہو جانا مراد کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ ریاست جیسا باشعور شخص اس انداز میں سوچے گا۔ اس نے بڑے اعتماد سے مسرت کو بات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

آخر ریاست ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ مراد نے بڑے درد کے ساتھ سوچا۔ سرحدیں بھی مقدس ہوتی ہیں لیکن وطن کی مٹی، دشمن کے قبضے میں جا کر بھی وطن کی مٹی رہتی ہے اور جب دشمن پسپا ہوتا ہے تو اس مٹی کو پہلے کی طرح پاک سمجھا جاتا ہے۔ ایک غلام

اور مجبور عورت سے پھر یہ نفرت کیوں؟

وہ غصے سے بولا۔ "ریاست، اگر کسی حادثے کو بنیاد بنا کر تم بے قصور بیوی کو طلاق دے رہے ہو تو یہ سراسر ظلم ہے۔"

ریاست بولا۔ "حادثہ اس کے ساتھ نہیں میرے ساتھ ہوا ہے مراد! میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔"

مراد کافی دیر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے قرآن و حدیث کے حوالے دیئے۔ بزرگوں کے اقوال سنائے اپنے احساس بیان کئے لیکن وہ اس مظلوم عورت کو کسی طور پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جلد ہی مراد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اب سمجھانے بجھانے کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ اسے اب مسرت کا ذکر بھی گوارا نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں اچانک مراد کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مسرت، ریاست، بلقیس اور مراد وغیرہ اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کوڑے کے ایک ڈھیر سے مرغی کا خراب انڈہ اٹھایا اور گھر لے آئے۔ مسرت نے یہ انڈہ اپنے گھر مرغیوں کے ڈربے میں رکھ دیا اور گھر والوں کو یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ مرغی نے انڈہ دیا ہے۔ بعد میں جب وہ اس انڈے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ انڈہ مسرت کے ہاتھوں سے گر گیا۔ وہ ایک پٹاخے کی طرح پھٹا اور سخت بدبو پھیل گئی۔ لیس دار مادے کے کچھ چھینٹے ریاست کے کپڑوں پر بھی پڑے۔ وہ اسی وقت گھر بھاگ گیا۔ کپڑے اتارے۔ دو تین بار مل مل کر نہایا۔ پھر بھی چین نہیں آیا اور شام کو دوبارہ نہانے لگا۔ اس واقعے کے بعد ایک عرصہ ان کے گھر لڑائی رہی۔ ریاست کی ماں جب بھی اسے وہ کپڑے پہنانا چاہتی جن پر انڈے کے چھینٹے پڑے تھے، وہ پہننے سے انکار کر دیتا۔ اس نے پھر کبھی وہ کپڑے نہیں پہنے۔ مراد کو یاد آیا کہ وہ کبھی کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا تھا۔ شکی اس قدر تھا کہ بچپن میں ایک دفعہ مراد نے اسے پیتل کے گلاس میں پانی لا کر دیا۔ جب نلکے سے پانی بھرا جاتا ہے تو پانی کی سطح پر جھاگ نما بلبلے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ریاست نے یہ کہہ کر پانی پینے سے انکار کر دیا کہ مراد اس میں تھوک کر لایا ہے ..... ہاں وہی ریاست اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اٹل لہجے میں کہہ رہا

تھا کہ مسرت کو اپنے گھر نہیں رکھے گا۔ ماہ و سال کی روانی، تعلیم، مذہبی لگاؤ۔ غرض کسی شے نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی اندرونی حقیقتیں برقرار تھیں۔

مراد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس پڑھے لکھے جاہل سے کس لہجے میں بات کرے۔ وہ کوئی موزوں الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ دفعتاً بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ مراد نے گھڑی دیکھی۔ تین بجنے والے تھے۔ ملک مختار گاڑی لے کر صبح کا نکلا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بتایا نہیں تھا لیکن مراد کا خیال تھا کہ وہ پیر سائیں کے کسی پرانے ملنے والے کی ٹوہ میں گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بارہ ایک بجے تک آ جاؤں گا۔ دروازے کی دستک سے مراد نے یہی سمجھا کہ وہ آ گیا ہے لیکن آنے والا ایک لمبا تڑنگا دیہاتی تھا۔ اس کے پیچھے دو تین افراد اور تھے لگتا تھا وہ دور سے بھاگتے ہوئے آئے ہیں۔ وہ سب کے سب ہانپ رہے تھے۔

لمبے تڑنگے شخص نے پکار کہا۔ "کیپٹن صاحب آپ کا مہمان ..... اسے جنگلی سؤروں نے جان سے مار دیا....."

چند لمحوں کے لئے مراد کا ذہن بالکل معطل ہو گیا۔ پھر اس نے چیخ کر پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

دیہاتی ہانپتا ہوا بولا۔ "صاحب کی کار، ادھر ذخیرے میں کھڑی ہے، قریب ہی کسی کی نچی ہوئی لاش پڑی ہے۔"

مراد کی آنکھیں دھیرے دھیرے سرخ ہونے لگیں اس کے ذہن میں پیر سائیں کی زرد چادر پھڑپھڑا رہی تھی ..... پھر وہ غضب ناک انداز میں اٹھا اور کسی تند بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی ماں اور خالہ آسی اس کے خطرناک تیور دیکھ کر اس کے پیچھے لپکیں لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ دہلیز پار کر چکا تھا۔ اس کا ذہن آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ملک مختار کی گمشدگی میں کس کا ہاتھ ہے۔ یہ صرف اور صرف پیر سائیں کا کام تھا۔

"پیر سائیں، آج تو مجھ سے نہ بچ سکے گا۔" اس کے جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا۔

گاؤں کی گلیاں اور مکان اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے صبر و تحمل کی سرحد پامال ہو چکی تھی۔ غیض و غضب کا آہن شکن ریلا دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا..... اور پھر وہ سبز دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔

"پیر سائیں! باہر نکل۔" وہ حلق کی پوری قوت سے دھاڑا۔ دروازے میں حرکت ہوئی اور مسلح "عقیدت مند" باہر نکلے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ بات تھی بھی حیرت کی۔ پیر سائیں کی محفل میں زیر لب گفتگو کی تلقین کرنے والوں نے ابھی ایک گستاخ اور کرخت آواز سنی تھی۔ وہ مراد کی طرف بڑھے اور ان کی یہ حرکت ان کے لئے قیامت بن گئی۔ مراد تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے دو افراد کو گریبانوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی داہنی ٹانگ بھرپور قوت سے ایک شخص کے پیٹ میں لگی۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ اچھل کر زمین پر گرا اور وہیں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ دوسرے شخص کے منہ پر ایک زوردار گھونسہ لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی لاٹھی استعمال کرتا، دوسرے گھونسے نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ دروازے کی دوسری جانب سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر پیر سائیں کے آٹھ دس "مرید" مراد کے سامنے آ گئے۔ مراد کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے قمیض کے نیچے سے بھرا ہوا ریوالور نکال لیا۔

"خبردار۔" اس کی آواز گونجی۔ "کوئی آگے نہ بڑھے۔" تمام افراد ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر ایک شخص نے ہمت کر کے مراد پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ مراد نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر بے دریغ ٹرائیگر دبایا دھماکہ ہوا اور گولی آگے بڑھنے والے کے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس وقت ایک دوسرے مرید نے مہم جوئی کی کوشش کی۔ اس نے آنکھ بچا کر زمین پر پڑی اینٹ اٹھائی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اینٹ مراد پر پھینکتا مراد کے ریوالور نے پھر شعلہ اگلا اور یہ گولی اس دوسرے شخص کو ڈھیر کر گئی۔ باقی مرید نہایت خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔

مراد انہیں ریوالور سے دھمکاتا ہوا دروازے تک لے آیا اور پھر تیزی سے اندر

داخل ہو گیا۔ پیر سائیں کی مجلس میں بیٹھنے والے افراد سہمے ہوئے ایک دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

"خبردار' اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔" مراد گرجا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ لوگ سہم کر کچھ اور پیچھے ہٹ گئے۔ مراد ان کی طرف رخ کر کے چلایا۔

"کہاں ہے پیر سائیں؟ ..... باہر نکل' میں تجھ سے حساب کرنے آیا ہوں۔"

اس کی آواز عمارت کے در دیوار سے ٹکرا کر گونجی اور جیسے پوری بستی میں پھیل گئی۔ عمارت کے صحن میں برگد کے درخت پر بیٹھی ہوئی لاتعداد چڑیاں فراٹے سے اڑ گئیں۔ شاید وہ بھی حیران تھیں کہ جس جگہ کبھی کوئی اونچی آواز سنائی نہیں دی' وہاں سے یہ کون چلا رہا ہے۔ ان کی حیرانی بجا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جہاں سکوت گہرا ہوتا ہے وہاں طوفان پلتے ہیں۔ جہاں موت کی خاموشی چھا جاتی ہے' وہاں اگلی آواز صورِ اسرافیل کی ابھرتی ہے۔ مراد نے ہاتھ بلند کر کے ایک ہوائی فائر کیا' دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔ اس نے مختلف کمرے دیکھے پیر سائیں کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ آخر وہ اس چھوٹے سے حجرہ نما کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ کمرے کا چھوٹا سا لیکن مضبوط دروازہ بند تھا۔ مراد کے پاؤں کی زوردار ٹھوکر دروازے پر پڑی۔ وہ زور سے چلایا۔

"پیر سائیں' باہر نکل' آج کوئی دروازہ تجھے پناہ نہیں دے سکے گا۔"

اندر یکسر خاموشی تھی۔ مراد زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دشمن کو اس پناہ گاہ سے باہر کیسے نکالے۔ اس وقت باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ چند لمحے بعد وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ مراد کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور اس کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ باوردی ایس پی اندر داخل ہو رہا تھا۔

وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں کہ پولیس کی بو سونگھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ وقتی طور پر اسے غضب نے مغلوب کر رکھا تھا لیکن بہرحال وہ ایک شریف اور قانون آشنا شخص تھا۔

وہ پستول ہاتھ میں لئے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ ایس پی کے پیچھے ایک سب انسپکٹر تھا اور سب انسپکٹر کے عقب میں وہی چہرہ نظر آ رہا تھا' کچھ دن پہلے جسے دیکھ کر ایس پی کا ہاتھ سلیوٹ کے لئے اٹھ گیا تھا۔

بھاری مونچھوں والا یہ شخص واسکٹ اور شلوار قمیض پہنے' ان دونوں کے پیچھے آ رہا تھا۔ ایس پی بھاری قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے مراد کو "ہینڈز اپ" کا حکم دیا۔ مراد نے جبڑے بھینچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ پھر ریوالور نیچے پھینک کر ہاتھ بلند کر دیئے۔ ایس پی نے تیزی سے آگے بڑھ کر پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ اس کے ہاتھوں نے پیشہ وارانہ چابکدستی سے مراد کی تلاشتی لی۔ پھر سب انسپکٹر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جھول رہی تھیں۔ مراد کے پاس ہاتھ آگے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چند ہی لمحے بعد اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے جا چکے تھے۔

اس وقت دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور پیر سائیں کا ہیولا تاریکی سے برآمد ہوا۔ حسبِ معمول اس کا نصف چہرہ زرد چادر کی اوٹ میں تھا۔ بڑی بڑی خوابیدہ آنکھیں اٹھا کر اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ مراد کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اس نے سنا تھا کہ مجرم پولیس کی حراست میں بھی اپنے دشمنوں پر حملہ کر کے انہیں ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ وہ سوچا کرتا تھا یہ کیسا جذبہ ہوتا ہے' جو انسان کو بھوکے درندے سے زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے ..... اس سوال کا جواب اسے آج پوری وضاحت سے مل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر وہ چند لمحے اور پیر سائیں کی عیار صورت دیکھتا رہا تو ایس پی کے پستول کی پرواہ کئے بغیر ہتھکڑی سمیت پیر سائیں پر ٹوٹ پڑے گا۔ اس نے جبڑے بھینچ کر اپنا رخ پھیر لیا۔ واسکٹ والا بارعب شخص آگے بڑھا اور بڑی عقیدت سے پیر سائیں کے ہاتھ چومنے لگا۔ پیر سائیں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ شخص ایس پی کی طرف مڑ کر بولا۔

"لے جاؤ اس بدمعاش کو۔" اس کا اشارہ مراد کی طرف تھا۔

ایس پی نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور مراد کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مراد کے

سینے سے ایک تلخ اور طویل سانس خارج ہوئی۔ اس نے صحن کی طرف قدم بڑھائے۔ وہاں لوگوں کا جمِ غفیر دکھائی دے رہا تھا۔ چند قدم چل کر وہ رکا اور ایس پی کی طرف مڑ کر بولا۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب! یہ شخص جو زرد چادر اوڑھے آپ کے سامنے کھڑا ہے' فراڈ ہے' مجرم ہے۔ اس شخص نے میری ماں کو حبسِ بیجا میں رکھا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا ہے اور میرے ساتھی کو اغوا کیا ہے۔ اس کا دامن ان گنت جرائم سے آلودہ ہے جناب....."

"شٹ اپ!" ایس پی گرجا۔ "جو کہنا ہو عدالت میں کہنا۔"

"اس گستاخ کو تو یہیں ٹکڑے کر دینا چاہئے۔" مجمع میں سے کوئی پکارا۔ پیر کے حمایتی قہر آلود نظروں سے مراد کو گھور رہے تھے۔ وہ سر جھکائے ان کے درمیان سے گزرنے لگا۔ تب ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"صاحب بہادر!" مراد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ مسرت تھی لیکن وہ مراد سے نہیں' واسکٹ والے شخص سے مخاطب تھی۔ واسکٹ والا شخص حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مسرت لوگوں کے درمیان سے نکل کر آگے آئی اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا انداز بڑا جذباتی تھا۔ شاید واسکٹ والا بھی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر مراد نے محسوس کیا کہ وہ اسے پہچاننے میں ناکام رہا ہے اس سے پہلے کہ ایس پی سخت لہجے میں مسرت سے کچھ پوچھتا' وہ واسکٹ والے سے بولی۔

"صاحب بہادر! آپ نہیں پہچانے لیکن میں آپ کو پہچان گئی ہوں۔"

واسکٹ والا جو ایک معروف سیاسی شخصیت اور نہایت اہم عہدیدار تھا۔ الجھن سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مسرت ڈرامائی لہجے میں بولی۔

"صاحب جی! آج سے سات آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور آپ کی بیوی ماری گئی تھی۔"

واسکٹ والے کے بارعب چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ بولا۔

"ہاں..... ہاں لیکن تم....."

مسرت اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

"صاحب جی! وہ طوفانی شام مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ میں اپنی ماں کے ساتھ دریا پار کے ایک گاؤں سے واپس آ رہی تھی۔ بارش اور آندھی کی وجہ سے ہم ایک جگہ رک گئیں۔ ایک جانب سے چیخیں سنائی دیں۔ یہ کسی چھوٹے بچے کی چیخیں تھیں۔ میں ماں کو وہاں چھوڑ کر چیخوں کی جانب بھاگی۔ پھر میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا۔ ایک عورت مُردہ حالت میں زمین پر پڑی تھی۔ یقیناً وہ آپ کی بیوی تھی۔ آپ اپنی کار کے پاس زمین پر گرے ہوئے تھے۔ دو آدمی آپ کو بری طرح مار رہے تھے۔ ڈیڑھ دو سال کا ایک معصوم بچہ چیختا ہوا درختوں کی طرف آ رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ کو مارنے والوں میں سے ایک شخص بچے کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ مجھ سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر چیختے چلاتے بچے کو اٹھایا اور درختوں میں بھاگ گئی۔ خنجر والا شخص دھمکیاں دیتا ہوا میرے پیچھے لپکا لیکن ..... میں اس کے ہاتھ نہیں آئی۔

مراد نے دیکھا واسکٹ والے کے چہرے پر زلزلے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر اس کے ہونٹ لرزے۔

"میرا بچہ ..... کہاں ہے میرا بچہ؟"

مسرت نے لرزاں لہجے میں کہا۔ "آپ کا بچہ محفوظ ہے صاحب جی ..... وہ میرے پاس ہے۔"

مراد کے ذہن میں وہ کمزور لیکن خوش شکل بچہ گھوم گیا جس کے سرہانے بیٹھی مسرت پنکھا جھلتی رہتی تھی۔

مزار کے صحن میں موجود لوگ حیرت سے گنگ یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اس واقعے کا پس منظر کیا ہے۔ آخر ایس پی بولا۔

"عظمت صاحب! یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟"

عظمت صاحب نے واسکٹ کی جیب سے سفید رومال نکالا اور آنکھوں میں امڈنے والے آنسو پونچھ کر بولے۔

"کھوسہ صاحب! آج سے آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک شام میں حضرت سائیں کو سلام کرنے کے لئے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ کار میں لوہاراں والی آ رہا تھا کہ راستے میں گھات لگائے ہوئے کچھ دشمنوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سیاسی رقابت کی بناء پر مجھے اور میرے خاندان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میری بیوی کو مار دیا اور مجھے شدید زخمی کر ڈالا لیکن میرے بچے کی جان بچ گئی۔ یہ لڑکی ..... ہاں یہ لڑکی ایک عظیم عورت کا روپ دھار کر آئی' اور اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر میرے بچے کو بچا کر لے گئی۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا بعد میں' میں بے ہوش ہو گیا اور وہ لوگ مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔"

اتنی بات کہہ کے عظمت صاحب تیزی سے مسرت کی طرف بڑھے۔ اسے شانوں سے تھام کر چند لمحے دیکھتے رہے تھے۔ پھر گلے سے لگا لیا۔

"بیٹی! تُو عظیم ہے۔ میں تیرا وہ روپ کبھی نہ بھول سکوں گا۔" ان کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

مسرت نے خود کو عظمت صاحب سے جدا کیا۔ کچھ دیر سرخ اشکبار آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے تو پھر ایک بیٹی کی بات مان لیجئے۔ اس کو چھوڑ دیجئے ..... اس کا کوئی قصور نہیں۔" مسرت کا اشارہ مراد کی طرف تھا۔

عظمت صاحب نے حیرانی سے پہلے مراد اور پھر مسرت کی طرف دیکھا اور بولے۔

"..... لیکن بیٹی یہ مجرم ہے۔ اس نے گولی چلا کر دو افراد کو شدید زخمی کیا ہے ..... اور حضرت سائیں کے حضور ناقابلِ تلافی گستاخی کی ہے۔"

مسرت دو قدم چل کر آگے آئی اور عظمت صاحب کے بالکل سامنے پہنچ گئی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر عظمت صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر

ھلک رہے تھے اور سر سے آنچل خود بخود سرک گیا تھا۔ پھر عجیب ڈرامائی انداز میں وہ بولی۔

"میں اگر آپ سے کوئی بات کہوں تو آپ یقین کریں گے!"

عظمت صاحب نے کہا۔ "آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا بیٹی۔ تیرے جیسی بیٹیوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات غلط نہیں ہوتی۔"

مسرت نے کہا۔ "چاہے وہ کتنی ہی عجیب ہو۔"

عظمت صاحب بولے۔ "ہاں' چاہے وہ کتنی بھی عجیب ہو۔"

مسرت نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے منہ ڈھانپا اور کچھ بولنے لگی۔ وہ بول رہی تھی لیکن آواز اتنی مدھم تھی کہ صرف عظمت صاحب سن رہے تھے اور یقیناً وہ کوئی قیامت خیز خبر سن رہے تھے۔ ان کا چہرہ زلزلوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ان گنت رنگ ان کے چہرے پر آ کر معدوم ہو رہے تھے۔ پھر مسرت نے رخ پھیرا اور ہچکیاں لیتی ہوئی لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

عظمت صاحب سکتے کے عالم میں کھڑے تھے ..... کتنی ہی دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر پیر سائیں کی طرف دیکھا ان کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی شخصیت نظر آ رہے تھے۔ پھر ان کی پُرغضب آواز گونجی اور ہر سماعت کو ششدر کر گئی۔ پیر سائیں کی طرف انگلی اٹھا کر وہ گرجے۔

"ذلیل انسان' مکار تُو فرشتے کے بھیس میں شیطان ہے ..... ابلیس' ملعون مجھے تجھ سے یہ امید نہ تھی۔ معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلنے والے جہنمی' تیرے منحوس چہرے سے نقاب اتر چکا ہے۔"

پھر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ پیر سائیں پر جھپٹے۔ پیر سائیں بوکھلاہٹ میں چند قدم پیچھے ہٹا۔ تب اس نے ایک پھریری لی اور جھٹکے سے اپنی زرد چادر اتار پھینکی۔ جب تک چادر ایک گھائل پرندے کی طرح لہراتی ہوئی فرش پر گری' پیر سائیں سیاہ رنگ کا خوفناک ریوالور نکال چکا تھا۔

"خبردار!" وہ ریوالور کا رخ ایس پی کی طرف کر کے دھاڑا۔ ایس پی کا ہولسٹر کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ پیر سائیں کی دھاڑ سنتے ہی مزار کے اندرونی حصے سے زرد پوشوں کی ایک جماعت نکلی اور پورے صحن میں پھیل گئی۔ شریف مسکین نظر آنے والے یہ تمام مریدانِ خاص اب ڈنڈوں' کلہاڑیوں اور بندوقوں سے مسلح تھے۔ مراد کے ساتھ ساتھ مزار کے احاطے میں موجود ہر فرد حیرت سے گنگ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مراد کے کانوں میں مسرت کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا مراد ..... اس گاؤں میں کسی نے اسے نہیں دیکھا وہ انسان نہیں' شیطان ہے ....." ..... تو اس کا اشارہ اس بہروپئے پیر کی طرف تھا۔ اس کا دھیان اپنی ہتھکڑیوں کی طرف چلا گیا اور اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ لوہا اس کے راستے میں حائل نہ ہوتا اور وہ پیر سائیں کو قتل کرنے کی سعادت حاصل کر سکتا۔

احاطے کے اندر اور باہر کھڑے لوگ خوفزدہ نظریں سے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاؤں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جو پیر سائیں کے ہر قول و فعل پر صاد کرنے کو تیار رہتا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں وہ لوگ بھی خاموش نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی طرف اٹھی ہوئی بندوقیں اور لاٹھیاں دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے کہ پیر سائیں اور اس کے مریدوں کو کیا نام دیں۔ مراد کے علاوہ عظمت صاحب' ایس پی اور سب انسپکٹر بھی ساکت کھڑے تھے۔ آخر مجمعے سے ایک عورت آگے بڑھی' اس نے ایس پی صاحب کی طرف دیکھا اور جھولی پھیلا کر چلائی۔

"مجھے انصاف چاہئے تھانیدار صاحب' مجھے پیر سائیں نے لوٹا ہے۔ میری بیمار بیٹی کو ٹھیک کرنے کے بہانے اس نے اس کا سارا جہیز ہتھیا لیا ہے۔"

پھر ایک اور شخص آگے بڑھا اور بولا

"میرے ساتھ بھی پیر سائیں نے دھوکا کیا ہے۔ اس نے میرا مکان چھین کر اپنے ایک مرید کو دے دیا ہے....."

مجمعے سے مختلف سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کوئی لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا باہر پھوٹنے کے لئے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ کوئی تاریک چٹان دھانے سے سرکتی جا رہی تھی کوئی سحر تھا' جو بتدریج ٹوٹ رہا تھا۔ لوگوں کے چہرے تمتمانے لگے تھے۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک پُرجوش آواز ابھری۔ یہ گاؤں کے بوڑھے امام مسجد کی آواز تھی۔ انہوں نے پورے زور سے پکار کر کہا۔

"دیکھتے کیا ہو لوگو! تمہارے سامنے پیر نہیں' بہروپیا کھڑا ہے۔ اس کے کالے کام ظاہر ہو چکے ہیں' پکڑ لو اسے' یہ تمہاری جانوں اور عزتوں کا قاتل ہے....."

مجمعے میں ایک لہر پیدا ہوئی۔ چند بوڑھے اور ناتواں جسم پیچھے ہٹے۔ کچھ جوشیلے صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دلوں نے دھڑک کر خون کو گرمایا۔ نگاہوں نے نگاہوں میں پیوست ہو کر حوصلوں کو تولا۔ ایک لمبے تڑنگے دیہاتی نے دیوانہ وار پیر سائیں اور اس کے حواریوں کی طرف دوڑ لگائی۔ "ٹھائیں' ٹھائیں" کی آواز سے گولیاں چلیں۔ دیہاتی لڑکھڑا کر احاطے کے عین درمیان گرا۔ تب چند اور نوجوان ڈنڈے لہراتے ہوئے پیر سائیں کی زرد فوج کی طرف بڑھے۔ پیر سائیں کے پانچ چھ آدمیوں نے لپک کر مراد' ایس پی اور سب انسپکٹر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ دیوار کے ساتھ کھڑے افراد نے بے دریغ گولیاں چلائیں اور دو مزید افراد ڈھیر ہو گئے۔ آگے بڑھتا ہوا مجمع ٹھٹک کر رک گیا۔ پُراعتماد قدم ڈگمگا گئے۔

"مارو انہیں۔" پیر سائیں کا ایک مرید زور سے پکارا۔ لاٹھیوں والے آگے بڑھے اور پیچھے ہٹتے ہوئے دیہاتیوں پر تابڑ توڑ لاٹھیاں برسانے لگے۔ مجمعے میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہوائی فائرنگ نے انہیں مزید خوفزدہ کر دیا۔ چند افراد نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے چند ہی لمحوں میں میدان صاف ہو چکا تھا۔

پیر سائیں نے اپنے ایک مرید کے کان میں کچھ کہا ..... وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ پیر سائیں گاؤں سے بھاگنے کا سوچ رہا ہے۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ ذرا دیر بعد اس کے دو صحت مند مرید ایک بوڑھے شخص کو سہارا دیئے ہوئے باہر نکلے۔ مراد فوراً پہچان گیا۔ وہ ملک مختار تھا۔ اس کے چہرے پر گہری چوٹیں

تھیں۔ قمیض پھٹی ہوئی تھی اور عینک ندارد۔ صاف ظاہر تھا کہ اس پر بری طرح تشدد کیا گیا ہے۔ عین اس وقت احاطے سے باہر کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ پیر کا ایک خاص آدمی اندر سے چمڑے کا بھاری بھرکم صندوق لے آیا۔ پیر جانے کے لئے بالکل تیار تھا کم از کم چھ رائفلیں ابھی تک مراد اور دونوں پولیس اہلکاروں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ پیر سائیں کے آدمیوں کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے دونوں افراد کی لاشیں صحن میں پڑی تھیں۔

عظمت صاحب پیر سائیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"تو قانون سے بچ نہیں سکتا۔ بھاگ کر تو اپنے گناہوں میں اضافہ کر رہا ہے۔"

پیر سائیں نے اپنی خوابیدہ آنکھیں اٹھا کر عظمت صاحب کو دیکھا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں گناہوں میں اضافہ ہوا ہے۔ دو بے گناہ افراد کو مروا کر گناہوں میں اضافہ کیا گیا ہے..... لیکن ان میں کمی کر دی جائے گی..... ہاں کمی کر دی جائے گی گناہوں میں لیکن اس کے لئے دو قربانیاں دینا ہوں گی۔ ایک بوڑھی قربانی اور ایک جوان۔"

"واہ واہ ..... سبحان اللہ.....!" مریدانِ باصفا بے اختیار پکارے۔ شاید وہ بات کی تہہ تک پہنچ رہے تھے۔ ایک مرید آگے بڑھا اور اس نے مراد کو کھینچ کر ملک مختار کے پہلو میں بٹھا دیا اور ایکا ایکی مراد کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے پیر سائیں کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ ملک مختار اور وہ پیر سائیں کے ساتھ جا رہے تھے۔ شاید پیر سائیں کا اشارہ دونوں کی قربانی کی طرف تھا۔ وہ انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔

عظمت صاحب نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "ان دونوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟"

پیر سائیں کی بجائے اس کا ایک مرید بولا۔ "یہ دونوں حضرت صاحب کے ساتھ جائیں گے اور خبردار اگر کسی نے حرکت کی کوشش کی تو بے دریغ گولی مار دی جائے گی۔"

اس دھمکی کے ساتھ پیر سائیں نپے تلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ملک مختار اور مراد عقب میں تھے۔ انہیں بندوقوں کی زد پر رکھا گیا تھا۔ ایس پی اور عظمت صاحب

بھی بندوقوں کے نرغے میں پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

سبز دروازے سے باہر 78 ماڈل کی ایک گرد آلود ٹیوٹا کار کھڑی تھی۔ کافی دور دور ٹولیوں میں لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن دو لاشیں دیکھنے کے بعد اب ان میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پیر سائیں کے آدمیوں نے بندوقوں کے رخ ان کی طرف پھیر کر ہوائی فائر نکالے اور یہ چند افراد بھی گلیوں میں روپوش ہو گئے۔ کار کے پچھلے دروازے کھولے دیئے گئے تھے مراد کو ہتھکڑی سمیت دھکیل کر اندر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد ملک مختار کی باری آئی۔ جب ملک مختار اندر بیٹھنے کے لئے نیچے جھکا۔ مراد کو اس کے چہرے پر ایک عجیب تاثر نظر آیا۔ اسے وہ کاؤ بوائے یاد آ گیا جو ایک دن بندوق لے کر اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا تھا اور پکارا تھا۔ "ہینڈز اپ" وہی جوانوں والی زندہ دلی اور جرأت ایک بار پھر ملک مختار کے چہرے پر نظر آ رہی تھی اور پھر وہی ہوا جو مراد نے سوچا تھا۔ دفعتاً ملک مختار سیدھا ہوا ..... گھوما اور اس کا زوردار مکا ایک رائفل بردار کے منہ پر پڑا۔ اسی پھرتی سے اس نے دوسرے بازو کی کہنی عقب میں آنے والے کے پیٹ میں ماری۔ ان لوگوں کو اس بوڑھے سے ایسی پھرتی کی مطلق توقع نہیں تھی۔ نوجوان سب انسپکٹر کے لئے اتنی مہلت ہی کافی تھی۔ وہ سرعت سے حرکت میں آیا اور قریبی رائفل بردار سے لپٹ گیا۔ مراد نے بھی تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا جب اس نے دیکھا کہ ایک لاٹھی بردار نے پورے زور سے لاٹھی سب انسپکٹر کے سر پر ماری۔ ملک مختار ایک بندوق بردار کو زوردار دھکا دیتا ہوا پیر سائیں کی طرف لپک رہا تھا۔ مراد نے ایک اٹھی ہوئی لاٹھی کا وار پھرتی سے جھک کر بچایا لیکن جس وقت وہ سیدھا ہوا اس نے ملک مختار کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ دوسری گولی مراد کی آنکھوں کے سامنے ملک مختار کی پشت میں داخل ہوئی اور خون کا فوارہ ابل کر پیر سائیں کے قدموں میں جا گرا۔

"ملک صاحب!" مراد حلق کی پوری قوت سے چیخا۔ چار افراد نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مراد انہیں وحشت میں کھینچتا ہوا ملک مختار کے قریب چلا گیا۔ ملک مختار کو ناقابلِ تلافی جسمانی صدمہ پہنچ چکا تھا۔ 303 کی پہلی گولی شانہ چیرتی ہوئی سینے کی طرف سے نکل

گئی تھی۔ انہوں نے اپنا خون آلود چہرہ اٹھا کر مراد کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔ روح، جسم کو الوداع کہنے کے لئے پر تول رہی تھی۔

"ملک صاحب!" مراد ایک بار پھر صدمے سے پکارا۔

ملک مختار کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ آخری الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوئے۔

"مراد..... کار..... ڈورز!" پھر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں جسم لرزا اور سر زمین پر ٹک گیا۔ مراد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹیں اور اس بزرگ دوست کے پہلو میں جذب ہو گئیں ..... اس کی کلائیاں ہتھکڑی میں تھیں اور بازو مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں۔ وہ پورے غصے، پوری نفرت اور طاقت سے تڑپا مچلا لیکن خود کو آزاد نہ کرا سکا۔ بالآخر ایک بندوق کا دستہ زور سے اس کے سر پر پڑا۔ اسے اپنی پیشانی پر خون کی نمی محسوس ہوئی اور نڈھال ہو کر اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ مسلح افراد اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے کار تک لے آئے۔ کار کے اگلے پہیوں کے پاس سب انسپکٹر بے ہوش پڑا تھا۔ ایس پی اور عظمت اللہ بندوق کی زد میں ساکت کھڑے تھے۔ مغرب کی طرف جھکا ہوا سورج بڑی محویت سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا آج وہ ڈوبنا بھول گیا ہے۔

مراد کو کار کے اندر دھکیل دیا گیا۔ دو سخت گیر افراد اس کے پہلوؤں میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور گھوم کر اپنی نشست پر آیا۔ پھر ایک شخص نے بڑے احترام سے کار کا اگلا دروازہ کھولا۔ پیر سائیں متانت سے چلتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ مراد بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خالہ آسی کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

جب انسان کے اندر خوف اور تحیر کا جذبہ جنم لیتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ کوئی معتبر اور کامل روحانی استاد اس کا ہاتھ تھام لے۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ بکھرے نام نہاد پیر فقیر اور بہروپئے انسان کے اسی فطری تقاضے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مراد اچھی طرح جانتا تھا۔ پیر سائیں ایسی ہی "فراڈ روحانیت" کا سوداگر ہے ..... لیکن اگر وہ جھوٹا تھا تو پھر غالب کیوں تھا۔ باطل ہو کر بھی حق پر حاوی کیوں چلا آ رہا تھا۔ کیوں بے بس کر چکا

تھا ساری بستی کو..... مراد سوچ رہا تھا اور اس کی نگاہیں پیر سائیں پر جمی تھیں۔ وہ کار کی طرف بڑھ رہا تھا اور کوئی پانچ گز دور تھا۔

دفعتاً مراد کو ایک غراہٹ سنائی دی یہ غراہٹ..... جھاڑیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یہ غراہٹ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ یہ غراہٹ ..... ہاں یہ غراہٹ مراد کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ٹینا کے کتے کی غراہٹ تھی لیکن وہ یہاں کیسے چلا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر رونڈ سکرین کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ بائیں طرف کی جھاڑیاں ہلیں اور ٹینا کا قد آور کتا نظر آیا۔ اس کی دم تیزی سے ہل رہی تھی۔ سینے سے ایک مسلسل اور پُرہول غراہٹ بلند ہو رہی تھی اور وہ یک ٹک پیر سائیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر غراہٹ تیز ہوئی اور وہ پُرشور آواز سے پیر سائیں پر جھپٹا۔ ایک زوردار چھلانگ کے ساتھ وہ پیر سائیں کے اوپر آیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ گرد کا بادل بلند ہوا اور کتا اور انسان (اگر وہ واقعی انسان تھا) اس میں گم ہو گئے۔ اب کتے کی خوفناک غراہٹوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بندوق برداروں کو مطلق سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کریں۔ لاٹھی بردار بوکھلاہٹ میں ناچ رہے تھے۔ پھر گرد کے مرغولوں سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ کوئی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلایا اور مراد نے دیکھا کہ ایک سیاہی مائل چیز لپکتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہو گئی ..... یہ ٹینا کا کتا تھا۔ بیمار اور خطرناک کتا۔ بندوق برداروں نے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔

گرد کا بادل چھٹا تو ایک انتہائی لرزہ خیز منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ نام نہاد پیر کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور گرد آلود آنتیں زمین پر بکھری تھیں لیکن اس سے بھی عجیب ایک اور بات تھی اور یہ بات موقع پر موجود تمام افراد کو لرزا دینے کے لئے کافی تھی۔ لاش کا سر تن سے جدا تھا..... اور موقع پر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جھوٹے پیر کے جھوٹے مریدان حیرت سے گنگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب طرح کی دہشت سرایت کرتی جا رہی تھی۔ مریدوں کے جوش اور غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے اب

سرسوں کی طرح زرد تھے۔ ان کی پھٹی نگاہیں اپنے روحانی پیشوا کا حشر دیکھ رہی تھیں۔ یہی وہ "باکمال" پیر تھا جو بستی کے در و دیوار پر آسیب کی طرح حکمرانی کرتا تھا اور یہی وہ باصفا ماشتے تھے جو پیر کے حکم پر اس کے روحانی کرشموں کا ناٹک رچاتے تھے۔ سیاہ لبادے پہن کر چار دیواریاں پھلانگتے تھے۔ مسہریاں قبرستانوں میں پہنچاتے تھے۔ اپنی اپنی نیند سوتے تھے لیکن ایک ہی "خواب" دیکھ کر لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے۔ اب وہ اپنی نگاہوں سے ایک ڈراؤنا منظر دیکھ رہے تھے لیکن یہ منظر خواب کا نہیں تھا..... ہاں یہ منظر خواب کا نہیں تھا۔

کونے کھدروں میں اکٹھے ہونے والے لوگ دھیمے قدموں سے چلتے ایک وسیع دائرے کی شکل میں چاروں طرف جمع ہو چکے تھے لیکن پھر اس سے پہلے کہ ہجوم تشدد پر اترتا۔ پلٹنے والے جھپٹنے کی کوشش کرتے۔ ایک طرف شور بلند ہوا۔ سیاہ قمیضوں اور خاکی پتلونوں کی جھلک دکھائی دی..... پولیس کی بھاری جمعیت موقعہ پر پہنچ چکی تھی۔

☆==========☆==========☆

وہ شاید اگست کی آخری شام تھی۔ بڑی ہی اداس اور گھمبیر۔ ایک عجیب طرح کا حبس فضا کو جکڑے ہوئے تھا۔ درختوں کے پتے ساکت تھے اور آسمان پر چھائی ہوئی گرد نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مراد گھنے درختوں میں ایک پگڈنڈی پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ملک مختار کی کھٹارہ کار کھڑی تھی۔ درختوں کے لاتعداد پتے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک چوتھائی ٹائر زمین میں دھنس گئے تھے۔ ملک مختار کو پیش آنے والے حادثے کے بعد سے یہ کار یہیں کھڑی تھی۔

آج مراد بہت اداس تھا۔ شاید زندگی میں وہ کبھی اتنا اداس نہیں ٹھہرا تھا۔

گلو شاہ کے گمراہ گدی نشین کو جہنم واصل ہوئے قریباً ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس ایک ماہ میں ان گنت واقعات رونما ہوئے تھے۔ کچھ مایوس کن اور کچھ خوشگوار ان دنوں کا ہر ہر پل اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ جھوٹے پیر کے لعنتی عقیدت مندوں کی گرفتاری' ملک مختار کی تجہیز و تکفین' عظمت اللہ اس کے معصوم بیٹے کی واپسی' ٹینا کے کتے کی پُراسرار

گمشدگی اور اس کی ناکام تلاش' مسرت کی طلاق اور ایسے ہی کئی واقعات ان ایام میں پیش آ چکے تھے ..... ہاں مسرت کی طلاق۔ مراد کی سوچوں کا دھارا مکمل طور پر مسرت کی طرف مڑ گیا۔ اسے ریاست نے طلاق دے دی تھی ..... پھر ایک دن مراد ایک عجیب ارادہ لے کر مسرت کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ سماج کی ان گنت رکاوٹوں کو عبور کر کے آیا تھا وہ ایک نئی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔ عورت کی عظمت بحال کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں جوت کی طرح جل رہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "مسرت میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" یہ الفاظ مسرت کے کانوں میں بم کا دھماکہ ثابت ہوئے تھے۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور انکار کر دیا تھا۔ مراد نے پچھلے دنوں اس فیصلے کو بدلنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے لیکن کامیاب نہیں ہوا ..... اور آخر اس نے ہمت ہار دی۔ آج وہ بہت مایوس تھا۔ کل اس کی واپسی تھی۔ وہ ڈیوٹی جوائن کر رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا اپنی اس رخصت میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اسے اپنی ماں ملی تھی' اپنا گھر ملا تھا اور اپنی شناخت ہوئی تھی لیکن وہاں اس نے اپنی زندگی کی تین عزیز ہستیوں کو گنوایا بھی تھا۔ اپنے باپ اور بھائی سے ملنے کی آس ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کھدائی میں صندوق کے ساتھ ملنے والا ڈھانچہ اس کے باپ یا بھائی کا تھا۔ اگر وہ ڈھانچہ اس کے باپ یا بھائی کا نہیں تھا تو کوئی اور ہو گا۔ سینکڑوں ڈھانچے اس پتن میں دفن تھے۔ ان کی کوئی شناخت نہیں تھی' وہ صرف ڈھانچے تھے ..... گمنام ڈھانچے تیسری عزیز ہستی جو اس نے کھو دی تھی وہ مسرت تھی۔ سرخ ہونٹوں والی ننھی لڑکی کی شبیہہ اس کے صفحۂ دل پر دھندلا گئی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب ڈیوٹی پر جا کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ کبھی "لوہاراں والی" اس نے دیکھا ہی نہیں تھا ..... اپنے گھر سے پہلی جدائی ہی آخری تھی' وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ کسی روز وہ اپنے اردلی کو ڈرائیور کے ساتھ بھیجے گا اور وہ اس کی ماں کو لے کر شہر آ جائے گا..... بس ان گلی کوچوں میں تلخ یادوں کے سوا اس کے لئے اور کچھ نہیں تھا۔

دفعتاً اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ

گیا۔ سفید لباس پہنے' لمبے بال شانوں پر بکھرائے مسرت کھڑی تھی' مراد جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

اس نے آنکھیں پھیلا کر آنسو روکے۔

"مراد!" مسرت نے آنسو بہاتے ہوئے عجیب لہجے میں کہا۔ "مجھے ..... کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

..... یہ الفاظ نہیں تھے مترنم گھنٹیاں تھیں جو مراد کی سماعت سے ٹکرائیں۔

"مسرت..... مسرت!" وہ بے تابی سے بولا۔ "میں زندگی بھر تمہیں سوچنے کا موقع دے سکتا ہوں۔" بے اختیار ہو کر اس نے مسرت کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

مسرت کچھ نہیں بولی۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ حبس زدہ فضا میں اچانک ہی مون سون کا قافلہ اتر آیا تھا۔ پھر ایکا ایکی بادل چھا گئے اور بوندیں پڑنے لگیں۔ جب تک وہ گاؤں واپس جانے کا سوچتے زوردار بارش ہونے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھاگتے ہوئے ملک مختار کی کھٹارہ کار کی طرف لپکے۔ یہ کار ان کے لئے اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ بھاری بھرکم دروازے کو جھٹکے سے کھول کر مراد اندر داخل ہوا اور عقبی دروازہ کھول کر مسرت کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ذرا جھجک کر وہ اندر آ گئی۔

بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ مراد اور مسرت بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ بچپن کی لاپرواہی اور بے باکی لوٹ آئی تھی۔

مراد کہانی سنانے والے انداز میں بتا رہا تھا کہ پہلے لفافے کا قصہ کیا تھا اور مسرت ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکائے دلچسپی سے سن رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا

..... پیر سائیں کے خاص مریدوں سے معلوم ہوا ہے کہ پیر سائیں آج سے بیس سال پہلے ہیڈ سلیمانکی کے ایک دور دراز گاؤں میں اپنا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہاں اس نے ایک بلند و بالا درخت کے اوپر اپنی چارپائی چڑھا رکھی تھی۔ وہ ہر وقت اس چارپائی پر ہی رہتا تھا۔ علاقے میں وہ "اونچے پیر" کے نام سے مشہور تھا۔ جو لوگ مرادیں لے کر اس

کے پاس آتے تھے وہ ان سے روپیہ پیسہ کچھ نہیں لیتا تھا۔ صرف زیورات قبول کرتا تھا اس کی "کرامت" سے زیور خاک میں تبدیل ہو جاتا تھا اور یہ خاک سوالی کی ہر مراد پوری کرتی تھی۔ ایک دفعہ گاؤں میں ایک اجنبی آیا۔ کسی طرح اسے پتہ چل گیا کہ یہ پیر سراسر فراڈ ہے۔ جو زیورات اسے لوگ دیتے ہیں وہ خاک میں تبدیل نہیں ہوتے بلکہ ایک جھولے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ اس نے پیر کا پول کھولنے کے لئے ان زیورات تک رسائی حاصل کی۔ یہ مالِ حرام برسوں سے ایک مدفون دیگ میں جمع ہو رہا تھا۔ یہ لاکھوں کا خزانہ تھا۔ اس شخص کا ارادہ تھا کہ لوگوں کی امانتیں لوگوں تک پہنچا دے لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب گاؤں کے لوگوں نے پیر کے فراڈ کا واضح ثبوت دیکھنے کے باوجود اسے جھوٹا سمجھنے سے انکار کیا۔ یہ انہی لوگوں کے زیورات تھے لیکن پیر سائیں کے حکم پر انہوں نے اپنے زیورات پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس اجنبی نے زیورات کی گٹھڑی سر پر اٹھائی اور یہ کہتا ہوا چل دیا۔ ٹھیک ہے اگر کسی کے نہیں تو میں لے جاتا ہوں۔ اس کے باوجود کوئی حقدار آگے نہیں بڑھا۔ وہ شخص اس گٹھڑی کے ساتھ لوہاراں والی پہنچ گیا۔

مسرت پورے انہماک سے سن رہی تھی۔ مراد بولا۔ "جانتی ہو وہ شخص کون تھا ..... وہ میرے والد تھے۔ ان بیش قیمت زیورات کے ساتھ وہ لوہاراں والی چلے آئے لیکن پیر کے آدمیوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ جب انہوں نے اپنے گرد خطرات محسوس کئے تو ان زیورات کو محفوظ ہاتھوں میں پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے زیورات کی گٹھڑی اپنے جگری دوست ملک مختار کو سونپی اور وہ اسے لے کر شہر چلا گیا لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ خود بھی شہر پہنچتے اور اس ذمے داری سے کسی طور چھٹکارہ حاصل کرتے 65ء کی جنگ چھڑی اور سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا۔

پیر سائیں جو اپنے علاقے میں قدرے مشکوک ہو چکا تھا وہاں سے "کاروبار" سمیٹ کر لوہاراں والی اٹھ آیا اور فریب دہی کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی گمشدہ "کمائی" کی تلاش جاری رکھی۔ تلاش بسیار کے بعد اسے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ جنگ سے چند روز

پیشتر محمد شفیع کو ایک خط موصول ہوا تھا اور یہی خط گمشدہ زیورات کی صحیح نشاندہی کر سکتا ہے۔

اب سوچنے کی بات تھی کہ وہ خط کہاں ہے۔ اگر 6 ستمبر کی صبح میرے والد یعنی محمد شفیع کے پاس نہیں تھا تو ظاہر ہے گھر میں ہو گا۔ پیر سائیں نے خط کے حصول کے لئے میری والدہ پر بے پناہ ظلم ڈھائے اور انہیں ایک عرصہ گھر میں قید رکھا اس کا خیال تھا کہ انہیں زیورات کے متعلق علم ہے لیکن وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔"

کار سے باہر مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی لیکن اندھیرا چھا رہا تھا۔ مسرت نے پوچھا۔ "مراد' مگر اب وہ لاکھوں روپے کے زیورات کہاں ہیں۔"

مراد نے سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "وہ زیورات اسی کار میں ہیں۔"

"اسی کار میں؟" مسرت حیرت سے بولی۔

"ہاں!" مراد بولا۔

"لیکن ..... لیکن مراد یہ کیسے ممکن ہے؟" مسرت نے کار کی خستہ حالت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ دراصل ملک مختار کو پکڑنے کے بعد پیر سائیں کے آدمیوں نے کار کا ایک ایک انچ ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ سیٹیں پھاڑ دی تھیں' فرش اکھاڑ دیا تھا۔ اپنی طرف سے انہوں نے پوری کوشش کی تھی اور مراد کی اطلاعات کے مطابق ملک مختار کے گھر پر بھی ایسے ہی دیوانہ وار تلاشی لی گئی تھی لیکن ملک مختار پھر بھی اپنے دوست کی امانت بچانے میں کامیاب رہا تھا۔

مراد نے کہا۔ "ذرا اندازہ تو لگاؤ۔ تمہارے خیال میں وہ زیور کہاں ہو سکتے ہیں؟"

مسرت نے ذہین نظروں سے مراد کی طرف دیکھا۔ مراد کی نظر کا تعاقب کرتی ہوئی اس کی نظر کار کے اگلے دروازے پر اٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ممکن تھا زیورات اس دروازے کے اندرونی خلا میں موجود ہوں۔ وہ آگے جھکی اور ہاتھ سے

دروازے دیکھ ڈالے لیکن کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا جس سے اندازہ ہوتا کہ زیور کسی دروازے کے اندر چھپائے گئے ہیں۔

آخر ہار ماننے والے انداز میں وہ مراد کی طرف دیکھنے لگی۔ مراد نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"مسرت! اس کار کے دونوں اگلے دروازے لوہے کی بجائے سونے کے ہیں....."

مسرت حیرت سے گنگ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مراد بولا۔ "تمہیں میں نے بتایا تھا نا کہ ملک مختار کا باپ لوہار تھا۔ ملک مختار خود بھی ڈھلائی کٹائی کا کام جانتا تھا۔ وکیل ہونے کے باوجود اپنے آبائی پیشے سے اسے دلچسپی تھی۔ قریباً نصف کروڑ مالیت کے اس سونے کو محفوظ کرنے کے لئے اس نے اپنی کھٹارہ کار میں سونے کے پیوند لگا دیئے تھے۔ یہ کار وہ لاپرواہی سے اپنی قدیم کوٹھی کے پورچ میں کھڑی کر چھوڑتا تھا۔ یہ بیہودہ کار دنیا کی قیمتی ترین کاروں میں سے تھی لیکن اسے چرانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

مرنے سے پہلے ملک مختار نے مجھے اس کار کے دروازوں کا اشارہ دیا تھا۔ معمولی سوچ بچار کے بعد میں مرحوم کا مدعا سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں آ کر میں نے کار کی بیرونی چادر سے رنگ کی دبیز تہہ کھرچی تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

مسرت حیرانی سے یہ سب کچھ سن رہی تھی آخر بولی۔ "اب اس سونے کا تم کیا کرو گے؟"

مراد نے کش لے کر گاڑھا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ "یہ سونا اب میرے باپ کی خواہش کے مطابق اصل وارثوں کے پاس پہنچے گا۔ ہو سکتا ہے اس رقم سے علاقے کی فلاح کا کوئی اجتماعی کام کیا جائے۔ بہرحال مجھے یقین ہے اب وہ لوگ اس اثاثے کی ملکیت سے انکار نہیں کریں گے۔ جھوٹے پیر کا سحر ٹوٹ چکا ہے۔ مسرت! ذہنوں کے آسیب زدہ گوشے شعور کی کرنوں سے آباد ہو رہے ہیں۔ نئی روشنی لہر لہر ہماری پلکوں پر اتر رہی ہے۔"

مسرت نے دیکھا باہر بارش تھم گئی تھی، بدلیوں کی اوٹ سے اکا دکا ستارے جھانکنے لگے تھے۔ دونوں کار سے باہر نکل آئے۔ گیلی مٹی کی خوشبو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ گاؤں کو جانے والی طویل پگڈنڈی ان کے قدموں کی منتظر تھی۔

☆==========☆==========☆

دُوسری منزل

میرا نام نوازاحمد خاں ہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ پولیس میں گزارا ہے۔ یہ بڑی ہنگامہ خیز زندگی تھی۔ ہر دن ایک نیا ہنگامہ لے کر آتا تھا اور ہر رات میں ایک کہانی پوشیدہ ہوتی تھی۔ میری پوسٹنگ زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہی اور دیہی علاقے جرم و سزا کی کہانیوں کے حوالے سے بڑے زرخیز ہیں۔ ویسے بھی یہ تقسیمِ ہند سے پہلے کا دور تھا۔ اُن دنوں حالات پر انگریز کی گرفت کمزور ہو رہی تھی اور اس طرح انگلش قانون بھی غیر مؤثر ہو رہا تھا۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں تو جرائم کا دور دورہ تھا۔ زیرِ نظر کیس میری پیشہ ورانہ زندگی کا ایک یادگار کیس ہے اور کئی برس گزرنے کے باوجود آج بھی اس کی تفصیلات روزِ اول کی طرح میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ کئی بار میرا دل چاہا ہے کہ ان تفصیلات کو قلمبند کروں' آج اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ یہ سچی روئیداد آپ کو پسند آئے گی کیونکہ حقیقت بہرحال افسانے سے دلچسپ ہوتی ہے۔

یہ واقعہ جودھ پور کے ایک نواحی قصبے کا ہے۔ اجمیر جانے والی بڑی سڑک اس قصبے کے بیچوں بیچ سے گزرتی تھی۔ آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی تھی۔ گاہے گاہے سکھ اور ہندو بھی آباد تھے۔ اکتوبر' نومبر کے دن تھے۔ میں اپنے سب انسپکٹر گابھا سنگھ کے ساتھ تھانے میں بیٹھا تھا کہ ایک دبلا پتلا ہندو اندر داخل ہوا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن قصبے میں سب اسے مسانی مسانی کہتے تھے۔ کالے کلوٹے جسم پر صرف ایک لنگوٹی باندھے رکھتا تھا۔ سر پر بڑی سی بودی تھی۔ پیشانی پر سفید لکیریں۔ ذات کا پکا برہمن تھا۔ قصبے سے باہر کھلی جگہ پر ایک شمشان گھاٹ تھا۔ مسانی اسی شمشان گھاٹ میں رہتا تھا۔ جب کوئی لاش جلانے کے لئے لائی جاتی تو مرنے والے کے عزیز مسانی کی ہتھیلی پر چار پیسے رکھ جاتے۔

ویسے وہ تھا بڑا لالچی۔ کوڑی کوڑی پر جان دیتا تھا۔ ایسے لوگ پولیس کے لئے بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ معمولی فائدے کی خاطر پولیس کو قیمتی معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی مسانی کو قابو کر رکھا تھا۔ ایک طرح سے میرے لئے وہ ہندو آبادی کا مخبر تھا۔ اسے کسی پر کسی طرح کا بھی شک پڑتا سیدھا میرے پاس آتا اور غیر جانبداری سے سب کچھ بتا دیتا..... اُس روز وہ آیا تو کچھ حیران حیران سا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ اصل موضوع پر آگیا۔ کہنے لگا۔

"کوتوال صاحب! کل رات بڑا انوکھا واقعہ ہوا۔"

میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا۔ پھر آواز دھیمی کر کے بولا۔ "آپ کو معلوم ہوگا رات دوجے پہر برکھا شروع ہوگئی تھی میں اپنے جھونپڑے میں آنند سے پڑا سو رہا تھا کہ ایک لاش آگئی..... کُل سات آٹھ آدمی تھے۔ اتنی خاموشی سے آئے جیسے چور آتا ہے۔ بڑے ڈرے ڈرے گھنی سے تھے۔ ان میں سے ایک جو چالیس پینتالیس برس کا موٹا سا آدمی تھا کہنے لگا کہ ہم ندی پار کے گاؤں سے آئے ہیں میری پُتری کا دھیانت ہوگیا ہے۔ ادھر ہمارے شمشان گھاٹ میں پانی کھڑا ہے۔ اس لئے ادھر آگئے ہیں۔ ذرا جلدی سے کرم کریا کا انتظام کردو..... میں نے کہا بھائیو! میرا تو کام ہی یہی ہے لیکن ذرا جلدی آتے تو اچھا تھا۔ اس وقت برکھا ہو رہی ہے' اگنی بجھ بجھ جائے گی..... کہنے لگے کچھ بھی ہے' ہم تمہیں خوش کردیں گے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لاش بھی کسی جوان محلا (لڑکی) کی تھی۔ میں نے انہیں سویرے تک ٹالنے کی کوشش کی لیکن نہیں مانے۔ میں نے سوچا اکیلا آدمی ہوں' کہیں اور ہی بپتا نہ پڑ جائے..... چتا تیار کی اور آگ دکھا دی۔ صبح آذانوں کے وقت وہ لوگ واپس چلے گئے۔"

بوڑھے مسانی کی روئیداد واقعی دلچسپ تھی۔ ایک جوان عورت کی لاش کے ساتھ صرف سات آٹھ آدمیوں کا آنا اور وہ بھی آدھی رات کو۔ یقیناً کوئی قانون شکنی ہوئی تھی۔ ندی سے پار میرے تھانے کے علاقے میں کوئی دس عدد دیہات تھے۔ اگر یہ لاش

انہی دیہات میں سے لائی گئی تھی تو میرے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ میں نے مسانی سے پوچھا۔

"تیرا کیا قیافہ ہے۔ یہ کہاں کے لوگ تھے؟"

مسانی نے اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں کو گھمایا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "نیل پور کے..... میں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا ہے۔ بیس بائیس ورس کا لڑکا ہے۔ پورے علاقے میں کیول اسی کے پاس پھٹپھٹی (موٹر سائیکل) ہے۔ میں نے ایک دفعہ اسے ندی کی پلیا سے گزرتے دیکھا تھا۔ کچھ بالکوں نے بتایا تھا کہ یہ پھٹپھٹی والا نیل پور کا رہنے والا ہے۔"

میں نے بوڑھے مسانی سے کچھ اور باتیں دریافت کیں اور شاباش کے ساتھ واپس بھیج دیا..... میرا سب انسپکٹر گابھا سنگھ مسلسل اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی یہ معاملہ خاصا پُراسرار محسوس ہو رہا تھا۔ نیل پور کا علاقہ ہمارے تھانے کی حد سے باہر تھا لیکن کسی اور تھانے میں بھی نہیں تھا۔ درحقیقت ابھی تک اس قصبے کی حد کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا ہماری ذمے داری زیادہ تھی کیونکہ ہم اس قصبے سے زیادہ نزدیک یعنی صرف پندرہ میل کے فاصلے پر تھے۔

گابھا سنگھ نے کہا۔ "کیا خیال ہے انسپکٹر نواز۔ میں ایک چکر لگا کر آؤں نیل پور کا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں..... اگر واقعی وہاں کوئی واردات ہوئی ہے تو تمہارے جانے سے مجرم ہوشیار ہو جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ نیل پور کے کسی باخبر شخص کو یہاں بلا کر بات کر لی جائے۔"

گابھا سنگھ بولا۔ "کسی اور کو کیوں۔ وہاں کے چوہدری شوبھا سنگھ کو کیوں نہ بلا لیا جائے۔ اس بہانے اس کے درشن بھی ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تم اسے جانتے ہو تو بلا لو۔"

☆=======☆=======☆

اگلے روز بعد از دوپہر سفید پائجامہ قمیض میں ملبوس چوہدری شوبھا سنگھ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسلح باڈی گارڈ تھا۔ چوہدری خود بھی کرپان اور ریوالور

سے لیس تھا۔ ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود وہ کچھ ڈرا ڈرا خاموش سا نظر آ رہا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے شمشان گھاٹ پر پیش آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کیا اور چوہدری کو بتایا کہ مجھے اسی سلسلے میں شک ہے۔

اچانک ہی چوہدری کے چہرے پر خوف کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔ وہ بے قراری سے پہلو بدل کر بولا۔

"تھانیدار صاحب! اچھا ہوا آپ نے خود ہی یہ بات چھیڑ دی۔ ہو سکتا ہے آپ مجھے نہ بلاتے تو مجھے آپ تھانے آنا پڑتا۔ میں کئی دنوں سے سخت پریشان ہوں، کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "شوبھا سنگھ مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔ بہتر ہو گا اگر تم صاف اور مختصر بات کرو۔"

شوبھا سنگھ نے گڑبڑا کر پگڑی درست کی۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"جناب! بات دراصل یہ ہے..... اچھا آپ نیل پور کے ٹھاکروں کو جانتے ہیں؟"

میں نے بے رخی سے کہا۔ "میں نیل پور میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جو کچھ بتانا ہے تم نے بتانا ہے..... اور میری درخواست ہے کہ ذرا جلدی بتاؤ۔"

شوبھا سنگھ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "جناب..... بات کچھ عجیب سی ہے..... لیکن کہے بنا چارہ نہیں۔ جو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے وہی کہہ رہا ہوں..... دراصل ٹھاکروں کی حویلی پر کسی ہوائی چیز کا قبضہ ہو گیا ہے..... آج سے ٹھیک چار مہینے پہلے ٹھاکر وشوا ناتھ حویلی کی بالائی منزل کے کتاب خانے میں بیٹھا تھا کہ بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اس کی لاش اگلے روز کرسی پر ملی۔ میز پر چائے کا کپ رکھا تھا۔ چند کتابیں کھلی پڑی تھیں اور کمرے کی کھڑکیاں دروازے اندر سے بند تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ٹھاکر پر کسی بیماری کا اچانک حملہ ہوا ہے، اور کچھ کہتے تھے کہ اس کی موت

ہوائی چیزوں کے سبب ہوئی ہے۔ ہمارے دیہات میں اس طرح کی افواہیں عام اڑتی رہتی ہیں۔ لوگوں نے اس واقعے پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی ٹھاکر کے وارثوں کا کہنا تھا کہ اسے دل کی بیماری تھی اور اسی بیماری نے اس کی جان لی ہے۔

ٹھاکر کو مرے ہوئے دو ماہ ہوئے تھے جب ایک اور واقعہ رُونما ہوا۔ ٹھاکروں کی ایک نوکرانی اس کمرے میں صفائی کرنے گئی جہاں ٹھاکر کی لاش پائی گئی تھی۔ اُس وقت حویلی کی بالائی منزل پر اور کوئی نہیں تھا۔ نوکرانی دوپہر تک اکیلی ہی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی..... اچانک اسے لگا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔ اس نے چیخ ماری اور گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی تو اچانک کسی نے پیچھے سے اسے دھکا دیا اور وہ لڑھکتی ہوئی نچلی منزل پر آگئی۔ چوٹیں لگنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی۔ وہ پورے تین روز بے ہوش رہی۔ کبھی کبھی اس کے منہ اور ناک سے خون بھی جاری ہوجاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیسے بچ گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ کئی ہفتے پاگلوں سی باتیں کرتی رہی۔

قصبے کے لوگوں میں اس واقعے کا خوب چرچا ہوا۔ عام لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ حویلی میں جنوں کا سایہ ہے اور اس سے پہلے ٹھاکر کی موت بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی، مگر حویلی کے مکینوں کو ابھی تک اس بات کا یقین نہیں تھا۔ ملازمہ والے واقعے کے بعد قریباً دو ماہ سکون سے گزر گئے۔ کوئی نئی بات سننے میں نہیں آئی۔ پرسوں جو لڑکی مری ہے وہ ٹھاکر وشوانا تھ کی بڑی بیٹی تھی۔ پڑھی لکھی اور خوبصورت تھی۔ اس کا نام نرگس تھا۔ کوئی تین برس قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد خاوند سے ان بن ہوگئی۔ اب وہ اپنے پتا کے گھر ہی رہتی تھی۔ سوموار کی شام کھانا وغیرہ کھا کر اپنی چھوٹی بہن روپ وتی کے ساتھ وہ چھت پر ٹہلنے چلی گئی۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب دونوں بہنیں نیچے آئیں۔ دوسری منزل پر پہنچ کر نرگس نے روپ وتی سے کہا کہ میں تھوڑی دیر پتا کے کتاب خانے میں بیٹھنا چاہتی ہوں تم نیچے جاؤ۔ روپ وتی اسے چھوڑ کر نیچے آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں آکر سوگئی۔ رات کوئی گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر وہ

حیران ہوئی کہ نرگس ابھی تک اپنے بستر پر نہیں آئی۔ وہ ہمت کرکے باہر نکلی۔ ملازموں کو جگایا اور ان کے ساتھ اوپری منزل پر گئی۔ کتاب خانے میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ اچانک روپ وتی کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکل گئی۔ اس کی اکلوتی بہن کی لاش کمرے کی دہلیز پر پڑی تھی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ساڑھی کھل کر پاؤں میں الجھی ہوئی تھی اور چہرہ خوف سے بگڑ گیا تھا۔

اس واقعے کی خبر حویلی سے نکل کر قصبے میں پھیلی تو لوگ سہم گئے۔ اور واقعی یہ ایک خوفناک خبر تھی۔ قصبے کے بڑے پنڈت نے کہا کہ حویلی پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں اور ابھی اور جانوں کو خطرہ ہے۔ اس نے کہا کہ مرنے والی کی لاش کہیں دور جاکر جلائی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پوری بستی پر بداثرات ہوں گے..... یہی وجہ تھی کہ پرسوں قصبے کے کچھ افراد راتوں رات یہ لاش لے کر یہاں پہنچے اور شمشان گھاٹ کے چوکیدار کو دے دلا کر اس مصیبت سے چھٹکارہ پایا....."

چوہدری شوبھا سنگھ کی روئیداد خاصی سنسنی خیز تھی۔ اس پر من و عن یقین کرلینا کم از کم ہمارے لئے مشکل تھا۔ میری طرح سب انسپکٹر گابھا سنگھ بھی ایک حقیقت پسند آدمی تھا بلکہ وہ پکا پولیس والا بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جونہی شوبھا سنگھ یہاں سے گیا سب انسپکٹر اس کی ماں بہن ایک کرنی شروع کردے گا..... اور ایسا ہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد جب شوبھا سنگھ اپنی کتھا سنا کر دوسرے کمرے میں گیا تو گابھا سنگھ نے زیرلب مسکرا کر پہلے تو اسے دو تین گالیاں دیں پھر بولا۔

"الو کا پٹھا' تھانے میں الف لیلہ سنانے بیٹھ گیا ہے' بندہ پوچھے ہوائی چیزیں جوان عورتوں کی ساڑھیاں اتارتی ہیں اور نوکرانیوں کو سیڑھیوں سے دھکے دیتی ہیں۔ انہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا؟"

میں نے کہا۔ "گابھا سنگھ تیرا کیا خیال ہے؟"

گابھا سنگھ تجربہ کار سب انسپکٹر تھا اور چند ہفتوں میں انسپکٹر بننے والا تھا۔ جونیئر ہونے کے باوجود وہ میرے ساتھ بے تکلف تھا اور کھل کر بات کرتا تھا۔ کہنے لگا۔

"نواز صاحب! کسی اور کا تو پتہ نہیں لیکن یہ جو کُڑی نرگس والا معاملہ ہے یہ سراسر قتل کا ہے۔ کُڑی کو قتل کیا گیا ہے..... اور ہو سکتا ہے یہ کام گھر والوں کا ہی ہو..... ممکن ہے..... بلکہ یقیناً ایسا ہے کہ کُڑی کا کوئی آشنا تھا جو اس سے ملنے آتا تھا۔ گھر والے پہلے تو اسے منع کرتے رہے مگر جب دیکھا کہ پانی سر سے گزر گیا ہے تو گلا دبا کر ہلاک کر ڈالا اور یہ مشہور کر دیا کہ ہوائی چیزوں نے مار دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ آشنا لڑکی کا خاوند ہی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ چوری چھپے اسے منانے کے لئے آتا ہو اور اسی میل ملاپ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو۔ گھر والوں نے عزت بچانے کے لئے لڑکی کو مار ڈالا ہو!"

"بالکل بالکل۔" گابھا سنگھ نے جوش سے کہا۔ "آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ چوہدری کی باتوں پر غور کیا جائے تو شک ہوتا ہے کہ حویلی میں رہ کر بھی لڑکی کے اپنے خاوند سے تعلقات تھے۔ ویسے اس سے ایک اور شک بھی نکلتا ہے..... اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے لڑکی کو اس کے خاوند ہی نے مارا ہو۔ وہ خوبصورت تھی اور خوبصورت بیوی جو میکے میں روٹھ کر بیٹھ رہے خاوند کے لئے زندگی موت کا سوال بن جاتی ہے۔ ممکن ہے نرگس کی بے وفائی سے مشتعل ہو کر شوہر نے اس کا ٹیٹوا دبا دیا ہو۔"

کافی دیر بیٹھے ہم اس موضوع پر بحث کرتے رہے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سب انسپکٹر گابھا سنگھ، چوہدری کے ساتھ ہی نیل پور جائے گا اور ٹھاکروں سے مل کر اس معاملے کی پوری تحقیق کرے گا۔

☆=======☆=======☆

گابھا سنگھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کے ساتھ نیل پور چلا گیا۔ میں اس دوران تھانے کے کچھ کاموں میں مصروف رہا۔ گابھا سنگھ کی واپسی ڈیڑھ ہفتے بعد ہوئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو مجرم بھی تھے۔ ان میں ایک پچیس چھبیس سال کا خوبرو جوان تھا۔ دوسرا کوئی کھیت مزدور لگتا تھا۔ گابھا سنگھ نے خوبرو جوان کا نام اجے بتایا اور کہا کہ یہ نرگس کا شوہر ہے۔

اپنی تفتیش کی کہانی سناتے ہوئے گابھا سنگھ نے کہا کہ اس نے قصبے اور حویلی سے مکمل معلومات حاصل کی ہیں۔ حویلی میں اوپر تلے دو موتوں کے بعد قصبے میں کافی ہراس پایا جاتا ہے مگر اب یہ ہراس آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ جہاں تک حویلی کا تعلق ہے وہاں ٹھاکر کی موت کے بعد اس کی دونوں بیٹیاں یعنی نرگس اور روپ وتی تنہا رہ گئی تھیں اس لئے ان کا تایا ٹھاکر دلجیت کمار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حویلی میں آ گیا تھا۔ ٹھاکر وشوانا تھ کی طرح دلجیت کمار بھی ایک نیک نام شخص ہے اور ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے اندازہ ہو کہ نرگس کی موت میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس نے تفتیش کے سلسلے میں پورا تعاون کیا ہے اور اسی کی مدد سے مقتولہ نرگس کا شوہر اجے گرفتار ہوا ہے۔ اس بات کی کھلی شہادتیں ملی ہیں کہ اجے چوری چھپے حویلی میں داخل ہو کر نرگس سے ملتا تھا وہ ہر صورت نرگس کو گھر واپس لے جانا چاہتا تھا۔ مگر نرگس کا باپ مرحوم وشوانا تھ اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ لہٰذا نہایت سنجیدگی سے یہ شک بھی کیا جا سکتا ہے کہ اجے نے پہلے اپنے سسر کو ٹھکانے لگایا ہو اور بعد ازاں بیوی کی زندگی سے کھیل گیا ہو..... جن حالات میں اجے اور نرگس کی شادی ہوئی وہ بھی پولیس کے لئے قابلِ توجہ ہیں۔ نرگس شہر سے تعلیم حاصل کر کے آئی تھی اور اجے ایک مقامی اسکول میں ماسٹر ہے۔ کسی طرح ان دونوں میں راہ و رسم ہو گئی۔ بات دور نکلنے لگی تو ٹھاکر وشوانا تھ نے باعزت طریقے سے دونوں کی شادی کر دی۔ وہ داماد کو ہم مرتبہ بنانے کے لئے اس کی مالی امداد کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں انا اور خودداری کچھ زیادہ تھی۔ وہ بیوی کو غربت کے ماحول میں کھینچ کر لے گیا۔ چند ماہ تو ٹھیک گزرے پھر میاں بیوی میں زبردست اَن بن ہو گئی۔ نرگس روٹھ کر باپ کے گھر آ بیٹھی۔ اجے کو ان باتوں کا شدید رنج تھا۔ وہ ہر صورت اپنی شرطوں پر بیوی کو گھر واپس لے جانا چاہتا تھا۔ یہ کشمکش جاری تھی کہ ٹھاکر وشوانا تھ کی موت واقع ہو گئی۔

میں نے سب انسپکٹر گابھا سنگھ کی رپورٹ کا غور سے مطالعہ کیا اور اس کی دلیلوں میں کافی وزن پایا لیکن کہیں کہیں کچھ جھول بھی محسوس ہوا۔ اس کا ذکر میں آگے جا کر

کروں گا..... میں گابھا سنگھ کی آمد کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ نیل پور سے خاصا پُرامید لوٹا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق اُس نے آتے ساتھ ہی اجے کمار کو حوالات میں لمبا لٹا دیا اور دو تین گھنٹے خوب پٹائی کی۔ شام تک اُس کی چیخوں سے تھانہ گونجتا رہا۔ شام کے بعد میں حوالات میں گیا تو اُس بیچارے کی حالت بہت پتلی تھی۔ ایک حوالدار ایک ہاتھ میں چھتر اور دوسرے میں گلاس لئے اُسے پانی پلا رہا تھا۔ گابھا سنگھ بھی پاس ہی تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"کوئی بیان دیا اس نے؟"

"نہیں نواز صاحب!" گابھا سنگھ غرا کر بولا۔ "لگتا ہے اس کی چتا تھانے ہی میں جلے گی۔"

دوسرا ملزم بھی وہیں تھا۔ یہ ایک کھیت کا مزدور تھا۔ اس کا نام بشیر تھا اور اسے اجے کا جگری دوست سمجھا جاتا تھا۔ گابھا سنگھ اسے بھی پکڑ لایا تھا کہ شاید اس نے واردات میں اجے کی مدد کی ہو۔

میں نے اس بشیر نامی شخص کو گابھا سنگھ کے چنگل سے نجات دلائی اور اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آگیا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ میں کچھ دیر اُس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اُس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے کہا۔

"دیکھو بشیر! تم میرے ہم مذہب ہو اس لئے تمہیں ہمدردانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس معاملے سے نکل جاؤ۔ یہ ایک سنگین کیس ہے اور ہو سکتا ہے اجے اپنی بیوی اور سسر کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی پا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وعدہ معاف گواہ بن کر سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ اگر اس جرم میں تمہارا کچھ کردار ہے بھی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کم از کم سزا دلواؤں گا....."

بشیر پریشانی کے عالم میں میری باتیں سنتا رہا۔ آخر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"تھانیدار جی! میں سیدھا سادا بندہ ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بلکہ بول ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کے لئے چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے آپ کو بتا دیتا

ہوں۔ اگر میں اس سے زیادہ کچھ بتاؤں گا تو وہ جھوٹ ہوگا اور آپ کی مار کی وجہ سے بتاؤں گا۔"

سیدھے سادے کسان نے بڑی اعلیٰ بات کی تھی۔ میں اس بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ لہجہ مزید نرم کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "شاباش! میں یہی چاہتا ہوں کہ تم جو کہو سچ کہو۔"

وہ بولا۔ "تھانیدار جی! اجے میرا دوست ہے اور سچی بات ہے کہ وہ بھرجائی نرگس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اُس کی خاطر وہ اپنا خون پسینہ تو کیا اپنی جان تک نچھاور کر سکتا تھا مگر اُس کی صرف ایک آرزو تھی۔ نرگس اُس کے گھر میں اُس کی غریبی کے ساتھ نبھا کرے..... اور وہ تھی بھی نبھا کرنے والی' بڑی صابر شاکر اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ شادی کے بعد چار مہینے اُس نے اجے کے گھر میں ایسے گزارے جیسے ٹھاکروں کی حویلی میں نہیں کسی جھونپڑے میں پلی بڑی تھی۔ اپنے ہاتھ سے دودھ دھوتی تھی' صفائی کرتی تھی' اپلے تھاپتی تھی۔ قصبے کی عورتیں دیکھ دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دیتی تھیں۔ اُس نے اپنا آپ اجے کی محبت میں اس طرح مار لیا تھا کہ سب کچھ بھول گئی تھی..... اور اجے تو تھا ہی اُس کا دیوانہ۔ رات دن اُسی کے فکر میں رہتا تھا۔ اُسے اچھی طرح پتہ تھا کہ نرگس اس کی خاطر دکھ جھیل رہی ہے وہ اسے سکھی کرنے کے لئے دن رات محنت کرتا تھا۔

مگر پھر ایک روز ایسی بات ہوگئی جس نے چند ہی دنوں میں سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا..... نرگس کچھ بیمار تھی۔ اجے اُسے میری گھوڑی پر بٹھا کر ایک ساتھ والے گاؤں حکیم کو دکھانے لے جا رہا تھا۔ اتفاق سے راستے میں ٹھاکر وشوا ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنی نئی موٹر پر ڈرائیور کے ساتھ شہر سے واپس آ رہے تھے۔ بیٹی کو بیماری کی حالت میں گھوڑی پر سوار دیکھ کر اُن کا خون کھول اٹھا۔ اجے سے کہنے لگے کہ اگر نرگس بیمار تھی تو حویلی میں اطلاع دی ہوتی تاکہ وہاں سے موٹر آجاتی۔ اس کے بعد انہوں نے نرگس کو گھوڑی سے اتار کر موٹر پر سوار کیا اور حکیم کے پاس لے گئے۔ اجے جب گھوڑی پر

سوار حکیم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹھاکر صاحب نرگس کو گھر لے گئے ہیں۔ اجے خاموشی سے واپس آگیا۔ اُس کا خیال تھا کہ شام تک کوئی خود موٹر پر اُسے چھوڑ جائے گا مگر پانچ روز گزر گئے۔ نہ نرگس آئی اور نہ اُس کی کوئی خبر۔ یہ پانچ روز اجے نے کیسے گزارے مجھے ہی کچھ معلوم ہے۔ آخر وہ نرگس کا پتہ کرنے خود حویلی پہنچا۔ نرگس کے پتا ٹھاکر وشواناتھ خود بھی حکمت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اپنے طور پر بیٹی کا علاج کرنے میں مصروف تھے۔ اجے نے اُن سے نرگس کو لے جانے کی اجازت مانگی تو وہ غصے میں آگئے۔ سسر اور داماد میں تکرار ہوئی اور ٹھاکر صاحب نے اجے کو سخت برا بھلا کہا۔ اجے ناراض ہو کر واپس آگیا۔ یہ اُس طویل جدائی کا پہلا دن تھا جس کا انجام آخر کار نرگس کی موت پر ہوا۔ ان دو ڈھائی برسوں میں صرف تین دفعہ نرگس اور اجے کی ملاقات ہوئی اور وہ بھی آخری چھ مہینوں میں۔ ان ملاقاتوں کی خواہش نرگس نے ظاہر کی تھی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اجے اُس سے ملنے چوری چھپے حویلی میں جاتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ بھی حویلی میں نہیں گیا۔ پہلی ملاقات بیساکھی کے میلے میں ہوئی تھی۔ دوسری دو ملاقاتیں نرگس کی ایک سہیلی کے گھر ہوئی تھیں۔"

بشیر کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "کیا ہو سکتا ہے کہ اجے نے ٹھاکر یا نرگس میں سے کسی کو قتل کیا ہو؟"

بشیر بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "نہیں تھانیدار صاحب! دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن اجے کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اپنے بارے میں۔ وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ ہوا ہے۔ کیا تیرا بھی خیال ہے کہ یہ ہوائی چیزوں کا کام ہے۔"

بشیر انکساری سے بولا۔ "میں جاہل بندہ کیا کہہ سکتا ہوں جناب' حویلی میں کوئی نہ کوئی بات تو ہے جو سب لوگ یہی کہتے ہیں لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ایسے موقعے تفتیش کرنے والے کے لئے بڑی قیمتی ہوتے ہیں۔ میں نے بشیر کی "لیکن" کو فوراً

پکڑ لیا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

"نن نہیں..... کچھ نہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھ بشیر! میں پھر کہہ رہا ہوں اگر تجھے اپنی اور اپنے دوست کی بھلائی منظور ہے تو کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔"

میری دھمکی پُر اثر ثابت ہوئی۔ بشیر تھوک نگل کر بولا۔

"جناب! معمولی آدمی ہوں۔ ڈرتا ہوں مصیبت میں نہ پھنس جاؤں..... یہ ٹھاکر دلجیت کوئی اتنا اچھا آدمی بھی نہیں ہے شاید آپ کو معلوم نہ ہو یہ نرگس اور روپ وتی کا سگا تایا نہیں....."

یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ میری حیرانی کو بھانپ کر بشیر بولا۔ "یہ ٹھاکر وشواناتھ کا ایک دور کا رشتے دار ہے۔ مرحوم ٹھاکر نے اسے بھائی بنا رکھا تھا۔ بڑا ہوشیار شخص ہے۔ مرحوم ٹھاکر اس کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا۔ ٹھاکر دلجیت کا ایک لڑکا جگجیون بھی ہے۔ وہی جو کالے رنگ کی ایک بڑی سی پھٹپھٹی (موٹر سائیکل) بھگاتا پھرتا ہے۔ بڑا کایاں لڑکا ہے۔ مرحوم ٹھاکر کی وصیت کے مطابق اُس کی موت کے بعد دونوں باپ بیٹا حویلی میں آگئے ہیں اور ایک طرح اب وہی مالک ہیں۔ ٹھاکر کا اور کوئی قریبی رشتے دار تو ہے نہیں۔ ٹھاکر دلجیت ہی زمینوں اور کاروبار کا حساب کتاب رکھتا ہے....."

میں نے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو؟"

بشیر سادگی سے بولا۔ "جناب..... میں کوئی ہوائی چیزوں کا منکر نہیں۔ اللہ معاف کرے کسی پر بھی برا وقت آسکتا ہے لیکن مجھے اس معاملے میں شک ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے ٹھاکر دلجیت کا اس میں کوئی ہاتھ ہو۔"

بشیر نے جو کچھ کہا تھا وہ بہت قابلِ غور تھا۔ اب تک کی معلومات سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹھاکر دلجیت ایسا شخص ہے جسے ٹھاکر وشواناتھ اور اُس کے وارثوں کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھے سب انسپکٹر گابھا سنگھ کی حماقت پر غصہ آنے لگا۔

اُسے زیادہ توجہ ٹھاکر دلجیت اور اُس کے بیٹے پر دینی چاہیئے تھی۔ وہ مرحوم ٹھاکر اور اُس کے اہلِ خانہ سے قریب تھے اور ٹھاکر کی زندگی میں بھی حویلی میں اُن کا آنا جانا تھا۔

..... یہاں مسئلہ یہ تھا کہ حویلی میں مرنے والے دونوں افراد یعنی ٹھاکر وشوانا تھ اور اُس کی بیٹی ہندو تھے اور ہندو مُردے کی قبر کھول کر پوسٹ مارٹم کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باپ بیٹی کے جسم راکھ ہو کر گنگا میں بہہ چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی جرم کا نشان خاک ہو چکا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوئے تھے' زہر خوردنی سے یا کسی اور وجہ سے..... میں نے اس بارے میں بشیر سے کچھ سوال پوچھے' نرگس کا چہرا تو وہ نہیں دیکھ سکا تھا مگر مُردہ ٹھاکر کی صورت اُس نے ضرور دیکھی تھی۔ اُس نے یاد کر کے کہا کہ بظاہر ٹھاکر کے چہرے پر کسی تشدد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ زبان بھی ہونٹوں کے اندر تھی لیکن چہرہ ذرا نیلا تھا اور آنکھیں دہشت و خوف سے کھلی ہوئی تھیں۔

چہرے کی نیلاہٹ سے میرا دھیان زہر خوردنی کی طرف چلا گیا۔ ایسے کیسوں میں مرنے والے کا چہرہ عموماً نیلا ہو جاتا ہے اور جان کنی کے وقت تکلیف کی شدت سے آنکھیں پھیل جاتی ہیں..... میں نے اس بارے میں بشیر سے کئی ایک سوالات پوچھے اور پھر راز داری کا پابند کر کے اسے واپس لاک اَپ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد میں نے سب انسپکٹر گابھا سنگھ کو بلایا اور اسے اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اجے اور بشیر کی جان چھوڑ کر فوراً نیل پور واپس چلا جائے اور ٹھاکر دلجیت کو شاملِ تفتیش کرے۔ گابھا سنگھ کا اب بھی یہی خیال تھا کہ اصل مجرم اجے کمار ہے۔ لہٰذا وہ دوبارہ نیل پور جانے کے لیے حیل وحجت سے کام لے رہا تھا۔ آخر جب میں نے اسے باور کرایا کہ نیل پور جانا مفید ثابت ہو گا تو وہ تیار ہو گیا۔

دوسرے روز عملے کے تین افراد کے ساتھ علی الصبح وہ نیل پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان دنوں تھانے میں بہت کام تھا۔ علاقے میں رسہ گیری اور چوری کے بہت واقعات ہو رہے تھے۔ دو تین روز میں بہت مصروف رہا۔ چوتھے دن میں کچھ دیر آرام کرنے کے

لئے دفتر کو اندر سے بند کئے بیٹھا تھا کہ اچانک دل میں ایک خیال آیا۔ گابھا سنگھ اتنا بھی بے وقوف نہیں تھا کہ ٹھاکر دلجیت کی طرف اس کا دھیان ہی نہ جاتا۔ یقیناً اس نے بھی وہی کچھ سوچا ہو گا جو میں نے سوچا تھا بلکہ وہ تو نیل پور جانے سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ لڑکی کو مارنے اور چپ چاپ جلانے میں گھر والوں کا ہاتھ ہے مگر بعد میں وہ گھر والوں یعنی لواحقین کو بالکل نظر انداز کر گیا۔ میں جانتا تھا کہ گابھا سنگھ کو رشوت کی عادت ہے بعض کیسوں کو رشوت لے کر وہ بڑی خوبصورتی سے تباہ کر دیتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہاں بھی وہ لالچ کر گیا ہو۔ ٹھاکر دلجیت کے نوٹوں نے اس کا منہ بند کر دیا ہو اور وہ غریب ماسٹر کو پکڑ کر یہاں لے آیا ہو اور اگر ایسا ہوا تھا تو اس کے دوبارہ نیل پور جانے سے بھی کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ چند روز گزار کر اور آئیں بائیں شائیں کر کے واپس آجائے گا۔ بہت ہوا تو کسی نوکر چاکر کو پکڑ لائے گا۔

میں نے سوچا کہ مجھے خود اس معاملے میں دلچسپی لینی پڑے گی۔ ویسے بھی اب کام کا زور کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ رسہ گیروں کے دو تین بڑے گروہ گرفتار ہو گئے تھے اور امید تھی کہ اب چند ہفتے سکون سے گزریں گے۔ میں نے ارادہ کیا کہ کل دوپہر تک خود نیل پور کا رخ کروں گا اور خاموشی سے وہاں پہنچ کر گابھا سنگھ کی کارکردگی دیکھوں گا۔

لیکن اُسی روز سہ پہر کے وقت ایک ایسی خبر پہنچی جس نے سارے پروگرام درہم برہم کر کے رکھ دیے۔ نیل پور کے کچھ لوگوں نے آکر بتایا کہ ٹھاکروں کی حویلی میں سب انسپکٹر گابھا سنگھ مُردہ پایا گیا ہے..... یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ ہنستا مسکراتا قہقہے بکھیرتا' گالیاں بکتا اور گالیاں کھاتا گابھا سنگھ ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ وہ تو اپنی ترقی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بات بات پر اپنا سونے کے خول والا دانت چمکاتا تھا اور کہتا تھا انسپکٹر بنتے ہی سب سے پہلے ایک لڑکی کو گرفتار کروں گا اور لڑکی بھی ایسی کہ جدھر سے گزرے چانن کر دے۔ ایسی تھیوی (بیوی) لاؤں گا کہ سب کے دل پر آرے چلا دوں گا۔ اپنی ترقی اور شادی کے خواب دیکھتا دیکھتا وہ ایسا سویا تھا کہ حشر تک جاگنے کا پروگرام نہیں رکھتا تھا۔ بدنصیب..... صرف تین روز بعد اسے انسپکٹر بننا تھا اور ہمیں مٹھائی

کھلانی تھی۔ پتہ نہیں کیا کیا پروگرام بنا رکھے تھے اس نے یہ خوشی منانے کے۔

آخر یقین کرنا ہی پڑا کہ گابھا سنگھ اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ آسمان پر "لائن حاضر" ہوچکا ہے۔ شدید دکھ اور حیرانی کے لمحے گزر گئے تو سینے میں ایک آگ سی بھڑکتی محسوس ہوئی۔ اس آگ کی روشنی سے ایک عجیب طرح کا خوف اور تجسس بھی پھوٹ رہا تھا۔ آخر کیا ہے..... کیا ہے اُس حویلی میں کہ اُس کی چاردیواری مسلسل انسانی جانوں کو نگل رہی ہے؟ کیا اسرار ہے اُن در و دیوار میں کہ ارتھی پر ارتھی نکل رہی ہے؟ کیا یہ بھی ٹھاکر دلجیت کمار کی کوئی سیاہ کاری ہے یا..... پھر واقعی اُس حویلی پر کسی آسیب کا قبضہ ہے۔ ذہن میں سینکڑوں سوالات کلبلا رہے تھے اور ہر سوال آسیبی گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے جواب کو ڈھونڈ رہا تھا۔

اتنے میں وہ دو سپاہی بھی ہانپتے کانپتے پہنچ گئے جو گابھا سنگھ کے ساتھ گئے تھے۔ انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے جو کچھ بتایا اُس کا لبِ لباب یہ ہے۔

گابھا سنگھ اپنے عملے کے ساتھ مہمان خانے میں مقیم تھا۔ یہ مہمان خانہ حویلی کی نچلی منزل میں رہائشی حصے سے ذرا ہٹ کر ہے۔ حویلی کے مکین حویلی کو فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں کل ایک پارٹی آئی ہوئی تھی۔ سودا قریباً طے ہوچکا تھا جب گاہک کو بھنک پڑگئی کہ حویلی کی بالائی منزل پر دو موتیں ہوچکی ہیں اور ان موتوں کے اسباب کا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ حالانکہ گاہک ایک روشن خیال آدمی تھا لیکن ان پُراسرار حالات نے اُسے سوچنے پر مجبور کردیا۔ گابھا سنگھ بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اُس نے گاہک کی تسلی کے لئے کہا کہ قصبے والے بے وقوف ہیں کوئی آسیب وغیرہ کا چکر نہیں۔ یہ مرحوم ٹھاکر کا داماد تھا جس نے حویلی میں گھس کر دونوں قتل کئے اور اب وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔ اُس نے اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے دعویٰ کیا کہ وہ آج کی رات حویلی کی بالائی منزل پر گزارے گا۔

مکینوں نے حویلی کی بالائی منزل کو تالا لگا کر بند کر رکھا تھا۔ گابھا سنگھ نے جوشِ جوانی میں یہ تالا کھلوایا اور اپنا بستر ٹھیک اُسی کمرے میں لگوالیا جہاں ٹھاکر وشواناتھ مُردہ پایا گیا

تھا..... رات کوئی دس بجے تک وہ ٹھاکر دلجیت اور مہمانوں کے ساتھ بیٹھا گفتگو کرتا رہا۔ پھر اپنا ریوالور اور ٹارچ لے کر حویلی کی بالائی منزل پر سونے چلا گیا تھا..... رات کوئی ایک بجے کا عالم تھا جب ایک لرزہ خیز چیخ سے حویلی گونج اٹھی۔ یہ آواز حویلی کے رہائشی حصے میں زیادہ صاف سنی گئی۔ ٹھاکر دلجیت اپنے نصف درجن مسلح ملازموں کے ساتھ اوپری منزل پر پہنچا تو کتاب خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اتنی دیر میں گابھا سنگھ کا ساتھی ہیڈ کانسٹیبل اپنے سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ سب نے مل کر دروازہ توڑا..... دروازے کے پاس گابھا سنگھ کی لاش پائی گئی۔

..... قارئین یہ وہ حالات تھے جو مجھے تھانے میں سپاہیوں کی زبانی معلوم ہوئے۔ میں نے ضروری تیاری کی اور ایک اے ایس آئی کو قائم مقام بنا کر فوراً نیل پور کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہم گھوڑیوں پر سوار تھے۔ دور مغرب کی طرف سورج نیل پور کی گھاٹیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی تیرگی چھائی جارہی تھی۔

ہم کوئی پانچ گھنٹے میں نیل پور پہنچ سکے۔ اُس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ نیل پور ایک بڑا قصبہ تھا اور اس میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ قصبے میں دو بڑے مندر تھے لیکن مسجد یا گوردوارہ ایک بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کے باہر قصبے کے معززین نے ہمارا استقبال کیا۔ سب چہرے سوگوار اور خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ ٹھاکر وشواناتھ چالیس پینتالیس برس کا ایک موٹا سا آدمی تھا۔ اُس کا بیٹا جگجیون بھی قریب ہی کھڑا تھا۔ جگجیون نوجوان اور لباس سے تعلیم یافتہ دکھائی دیتا تھا۔

ان لوگوں کے عقب میں وہ حویلی تھی جس نے قصبے کے لوگوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ حویلی واقعی حویلی نظر آتی تھی۔ سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی، جن کا رنگ میں نے صبح دیکھا۔ حالانکہ اس علاقے میں برف باری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر حویلی کی کئی چھتیں مخروطی تھیں۔ دروازے اونچے اور قدیم طرز کے تھے۔ منڈھیروں کو خوبصورت کنگروں سے سجایا گیا تھا۔ کہیں کہیں برجیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ٹھاکر اور دوسرے لوگ ہمیں لے کر اندر داخل ہوئے اور دو تین راہداریوں سے گزر کر بالائی

منزل پر آگئے۔ یہ وہی بالائی منزل تھی جس کے بارے میں اب تک بہت کچھ سن چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زینے طے کرتے ہی عجیب طرح کی سنسنی محسوس ہونے لگی تھی۔ پرانے گھروں کے در و دیوار سے ایک طرح کی اُداسی اور وحشت ٹپکا کرتی ہے اور یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں' انہی خاموش دیواروں میں یکے بعد دیگرے تین انسان پُراسرار موت کا شکار ہوچکے تھے۔ اُس وقت کی کیفیت شاید میں لفظوں میں بیان نہ کر سکوں ایک عجب طرح کا ہراس دل و دماغ پر سوار تھا۔ بلند چھت کے نیچے قدموں کی چاپ بھی آسیبی قہقہوں کی طرح سنائی دیتی تھی۔ دو پنڈتوں نے ایک طویل راہداری میں دھونی جما رکھی تھی اور اناپ شناپ منتر پڑھنے میں مصروف تھے۔ آخر ہم کتاب خانے کے سامنے پہنچے اور ٹھاکر دلجیت نے ہاتھ بڑھاکر بلند و بالا دروازہ کھول دیا۔

ان لوگوں نے عقلمندی کی تھی کہ کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا کل رات ایک بجے تھا۔ دروازے کے بالکل پاس گابھا سنگھ کی لاش پشت کے بل پڑی تھی۔ اُس کی وحشت زدہ نگاہیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ وہ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھا لیکن ہولسٹر کمر سے بندھا ہوا تھا۔ مرنے سے پہلے گابھا سنگھ نے ہولسٹر کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میز پر چائے کی پیالی رکھی تھی اور ایک کتاب کے ورق پھڑپھڑا رہے تھے۔ شاید آخری وقت سے پہلے گابھا سنگھ وقت گزاری کے لئے کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے جب ٹھاکر وشوانا تھ مرا تھا تو بھی میز پر چائے موجود پائی گئی تھی۔ پیالی میں چائے کی تھوڑی سی مقدار موجود تھی۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا کہ وہ اس پیالی کو محفوظ کرلے۔ اس کے بعد میں نے گابھا کی لاش کا بغور معائنہ کیا' گردن یا جسم کے کسی حصے پر تشدد کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہاں متوفی کا سارا جسم نیلا پڑچکا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کی موت بھی زہر خوردنی سے ہوئی ہے۔

گابھا کی موت کو قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ لاش سے ہلکی ہلکی بُو اُٹھنے لگی تھی۔ میں نے کمرے کی کچھ چیزوں کے نمونوں کو لاش کے ساتھ فوراً ڈاکٹری معائینے کے

لئے روانہ کردیا۔

جونہی میں نے ابتدائی کارروائی مکمل کی ٹھاکر دلجیت کمار نے مجھے علیحدہ کمرے میں بلا بھیجا۔ اندر پہنچا تو وہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"انسپکٹر صاحب! ہم کل سے آپ ہی کا انتظار کررہے تھے۔ اب ہمیں ایک پل یہاں نہیں رہنا۔ میری گھروالی اتنی خوفزدہ ہے کہ کل سے پوجا پاٹ کے سوا اُس نے اور کچھ نہیں کیا؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھاکر جی' پوجا پاٹ کوئی بُری بات تو نہیں۔ انہیں چند روز اور رام رام کرنے دیجئے۔"

ٹھاکر بولا۔ "انسپکٹر صاحب' آپ کیسے آدمی ہیں۔ دس منٹ پہلے آپ اپنے ساتھی کی لاش پر کھڑے تھے اور..... اب مسکرا رہے ہیں۔ بھگوان کے لئے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "سنگین معاملہ ہے اسی لئے تو عرض کررہا ہوں کہ ایک آدھ روز مزید ٹھہرجائیے۔ سب انسپکٹر کی موت کوئی معمولی بات نہیں۔ کل تک کئی بڑے افسروں کو یہاں آنا ہے ایسی صورت میں آپ کی غیرموجودگی سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔"

ٹھاکر کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن میں اُسے سمجھا بجھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک رات کے تین بج چکے تھے۔ میرا رُخ کتاب خانے کی طرف تھا جہاں میرے ساتھی ضروری تفصیلات جمع کررہے تھے..... میں نیم روشن طویل راہداری سے گزر رہا تھا۔ آخری سرے پر صرف ایک گیس لیمپ روشن تھا اُس کی روشنی میں مختلف چیزوں کے سائے بڑے بھیانک لگ رہے تھے..... اچانک تاریکی سے ایک خوبصورت لڑکی نکل کر میرے سامنے آگئی۔ اُس کا انداز اتنا فوری تھا کہ ایک لمحے کے لئے میں ٹھٹک گیا۔ میں نے بمشکل اپنے حواس بحال کئے۔ لڑکی کی دھیمی رسیلی آواز سنائی دی۔ "پلیز! میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور لڑکی کے ساتھ چل دیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہی نرگس کی چھوٹی بہن روپ وتی ہے۔ بعد

ازاں یہ قیافہ درست نکلا۔ لڑکی مجھے ایک چھوٹے سے زینے کے راستے نچلی منزل پر لے آئی۔ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچ کر اُس نے دروازہ اندر سے بند کردیا تو میرے ذہن میں پھر شبہے سر اُٹھانے لگے۔ لڑکی قیامت کی حسین اور جوان تھی۔ ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ اُس کا بند کمرے میں پایا جانا کئی سنگین مفروضوں کو جنم دے سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "محترمہ! بہتر ہے آپ دروازہ اندر سے کھول کر بات کریں۔"

وہ بولی۔ "نواز صاحب' مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں نے ایسا صرف مجبوری کے تحت کیا ہے۔"

لڑکی کا لہجہ نہایت شائستہ اور پُراعتماد تھا' لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا وہ یہ تھی کہ اُسے میرا نام معلوم تھا۔ جہاں تک میرا خیال تھا میرے ماتحتوں میں سے کسی نے میرا نام نہیں لیا تھا۔ نہ ہی کسی مقامی شخص کو میرا نام معلوم تھا۔ اچانک مجھے خیال گزرا کہ یہ کام گابھا سنگھ کا ہے۔ لڑکی نے میرے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے سب انسپکٹر نے مجھے آپ کے بارے بہت کچھ بتایا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں بہت پہلے سے آپ کو جانتی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

لڑکی چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اچانک اُس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگی۔ "نواز صاحب' آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ بڑے خداترس ہیں۔ مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں۔ بھگوان کی سوگند..... میں بھی ایک مصیبت زدہ ہوں۔ فار گڈ سیک میری مدد کیجئے۔ مجھے اس دلدل سے نکالئے۔" میں ہکا بکا اس نادان لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب اُس کی سسکیاں کچھ مدھم پڑیں تو میں نے کہا۔

"اگر میں غلطی نہیں کررہا تو آپ کا نام روپ وتی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیسی مدد درکار ہے۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ تایا جان کو یہ حویلی بیچنے سے باز

رکھیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھیں مس روپ وتی' اگر آپ تفصیل سے نہیں بتائیں گی تو میرے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔"

اُس نے عجب بے تکلفی سے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ساتھ لے کر ایک عقبی کمرے میں آگئی۔ یہ کمرہ اُس کی خوابگاہ تھا۔ مجھے مسہری پر بٹھا کر وہ بڑی بے باکی سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ خوابگاہ کے خوابناک ماحول میں صرف ایک فٹ کے فاصلے پر اُس کا چمکتا دمکتا شعلہ صفت بدن میرے سامنے تھا لیکن وہ اپنے حسن کی تباہ کاریوں سے قطعی بے خبر تھی۔ مجھے اس کا یہ صاف ستھرا انداز اچھا لگا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"نواز صاحب! میں تایا جان کی بہت عزت کرتی ہوں۔ کیونکہ پتاجی کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی..... لیکن کچھ بھی ہے میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں اور بڑی مجبوری ہے کہ میرا ذہن سوچتا ہے اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس حویلی میں اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ بہت دہشتناک ہے اور کئی بار تو میرے جی میں بھی آئی ہے کہ ان دیواروں کے حصار سے نکل کر کہیں دُور چلی جاؤں۔ مگر میرے ذہن نے ہر بار مجھے روکا ہے۔ میں..... میں کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں کہ پتا' دیدی اور ایک پولیس ملازم کے قتل میں کسی بدروح وغیرہ کا ہاتھ ہے۔ نواز صاحب! آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے' کیا آپ ان باتوں پر یقین کرسکتے ہیں۔ یہ سب خوف اور وہم کی کارہ گری ہے جو لوگ ایسی باتیں کررہے ہیں اُن کے دل میں بھی کسی نہ کسی کونے میں یہ اعتراف موجود ہے کہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مس روپ وتی' دلوں کے حال کوئی نہیں جانتا۔ اب میں اور آپ پورے یقین سے سوچتے ہیں کہ ان واقعات کے پیچھے کوئی انسانی ہاتھ ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے دل کے کسی نہ کسی کونے میں یہ خدشہ موجود ہے کہ ہوسکتا ہے یہ واقعی آسیب و بدروح کا چکر ہو۔"

میری بات نے روپ وتی کے چہرے پر سایہ سا لہرا دیا۔ غالباً میں نے اُس کی دُکھتی

رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب یہ بتائیں کہ آپ کی مرضی کیا ہے؟ آپ کس پر شک کرتی ہیں؟

روپ وتی نے کہا۔ "نواز صاحب! مجھے کسی پر شک نہیں..... لیکن مجھے کبھی کبھی تایا کا لڑکا جیون عجیب لگتا ہے....." روپ وتی کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر بات بدل کر بولی۔ "میں نہیں چاہتی کہ یہ حویلی کسی وہم کا شکار ہو کر بِک جائے۔ اس حویلی کے ایک ایک پتھر میں میرے ماتا پتا اور میری دیدی کی ان گنت یادیں وابستہ ہیں۔ اس حویلی کے کمروں میں میرا بچپن گھوم رہا ہے۔ اس کے سبزہ زاروں میں میرا لڑکپن قلانچیں بھر رہا ہے۔ مجھے یہ حویلی دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اُن حادثوں کا کھوج لگانے کی کوشش کریں جو اس حویلی میں ہوئے اور اُن کا سبب ڈھونڈیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہوتا جارہا ہے کہ آپ ہر کام کر گزریں گے۔"

روپ وتی زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی لیکن اس کے انداز سے مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ وہ اپنے منہ بولے تایا اور اُس کے بیٹے پر شک رکھتی ہے اور حقیقتاً اُسے شک کرنا چاہیئے تھا۔ ٹھاکر دلجیت سنگھ شکل و صورت سے ایک جہاندیدہ شخص نظر آتا تھا عین ممکن تھا جائیداد کے حصول کے لئے اُس نے یہ خطرناک کھیل کھیلا ہو۔

☆========☆========☆

اگلے روز ڈی ایس پی صاحب خود موقعے پر پہنچے انہوں نے اب تک کی کارروائی پر رپورٹنگ لی اور ضروری ہدایات دے کر یہ کیس مکمل طور پر میرے سپرد کردیا.....

ہمارے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ سب انسپکٹر گابھا کو کس نے قتل کیا؟ اگر ٹھاکر دلجیت اور اُس کا بیٹا مجرم تھے تو کیا اُن میں اتنی جرأت تھی کہ وہ ایک پولیس افسر کو قتل کرکے قانون سے براہِ راست ٹکر لینے کا خطرہ مول لیں اور پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ سب انسپکٹر گابھا سنگھ تو دلجیت اور اس کے بیٹے کی بڑی حمایت کررہا تھا۔ اُس نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے انہیں شاملِ تفتیش کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ پھر انہیں سب انسپکٹر کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی' ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ دوبارہ نیل پور آنے کے

بعد سب انسپکٹر نے اپنی رشوت کا بھاؤ بہت زیادہ بڑھا دیا ہو یا کوئی ایسا مطالبہ کردیا ہو جسے ٹھاکر منظور نہ کرسکتا ہو اور افشائے راز کے خوف سے اُس نے انسپکٹر کو عیارانہ طریقے سے ٹھکانے لگادیا ہو۔ میں نے اس شک کو ذہن میں رکھتے ہوئے ٹھاکر دلجیت اور اُس کے ملازموں سے پوچھ گچھ کی جو دو روز جاری رہی۔ تمام ملازموں کے ذہن پر عجیب سا خوف سوار تھا۔ کوئی اسے کالی ماتا کے غضب سے منسوب کررہا تھا اور کسی کے خیال میں یہ دُرگا دیوی کا عتاب تھا۔ ڈھنگ کی بات کسی نے بھی نہیں کی۔ آدھے سے زیادہ ملازم جلد از جلد حویلی چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں پابند نہ کیا ہوتا تو وہ کب کے نو دو گیارہ ہوگئے ہوتے۔ (تاہم میری آمد سے قبل دو ملازم بھاگ چکے تھے۔ میں نے اپنے ایک اے ایس آئی کو پہلے روز ہی اُن کی تلاش پر لگا دیا تھا)۔

اب مجھے پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ کا شدت سے انتظار تھا۔ یہی رپورٹیں تفتیش کو کسی ڈگر پر لاسکتی تھیں..... اُس رات بھی میں انہی رپورٹوں کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو گھوڑا دے کر تھانے روانہ کیا تھا کہ وہ رپورٹوں کا پتہ کرے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن سپاہی واپس نہیں آیا تھا۔ اچانک آہٹ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مہمان خانے کی اس کھڑکی سے حویلی کے رہائشی حصے کا برآمدہ نظر آتا تھا۔ چاندنی رات میں مجھے برآمدے کے قریب ایک ہیولا سا نظر آیا جو احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے انداز نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ میں شب خوابی کے لباس میں تھا۔ سلیپر پہن کر باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شاہ بلوط کے پیڑوں کی آڑ لیتا ہوا میں برآمدے کی طرف بڑھا۔ ہیولا اب ایک راہداری میں گم ہوچکا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے سلیپر اتار دیئے اور ٹھنڈے یخ فرش پر ننگے پاؤں چلتا راہداری کی جانب آیا۔ ایک کمرے میں روشنی ہورہی تھی اور مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں تین روز پیشتر میں نے روپ وتی سے بات کی تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی تو اندر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ روپ وتی شب خوابی کے مہین لباس میں کرسی پر بیٹھی تھی اس کی دودھیا پنڈلیاں روشنی میں چمک رہی

تھیں۔ قریبی صوفے پر مجگیون براجمان تھا۔ دونوں کے چہروں پر برہمی نظر آتی تھی۔ مجگیون کہہ رہا تھا۔

"دیکھیں روپ! آپ نے کبھی ہماری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا..... پتا جی یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ نے انسپکٹر سے کوئی الٹی سیدھی بات کی ہے۔"

روپ وتی بیزاری سے بولی۔ "میں نے کسی سے اُلٹی سیدھی بات نہیں کی۔"

"تو پھر وہ کیوں ہم سے مجرموں کی طرح سوال و جواب کررہا ہے۔ ایک تو ویسے ہمارے دل غم سے پھٹ رہے ہیں اوپر سے اُس کی بک بک۔ آخر کسی نے تو اُس کے کان بھرے ہیں۔"

اچانک روپ وتی بھڑک کر بولی۔ "کان بھرنے کی عادت آپ لوگوں کی ہے۔ کیا آپ نے نوشاہ بھائی کے خلاف سب انسپکٹر کے کان نہیں بھرے تھے۔ اگر آج نوشاہ بھائی تھانوں میں ذلیل ہو رہے ہیں تو یہ کس کا کام ہے۔ آپ کا اور تایا جان کا ہے۔ ایک بے گناہ اور شریف انسان کو رسوا کرکے پتہ نہیں آپ کون سا پُن کر رہے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔ ہم نے کسی پر الزام تراشی نہیں کی اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں وہ اسکول ماسٹر اجے جسے آپ فرشتہ گردانتی ہیں، کسی راکھشس سے کم نہیں۔ میں نہیں کہتا لیکن..... وقت بتائے گا کہ وہ مجرم ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دن آپ اُس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہ کریں۔"

اجے کی بے عزتی پر روپ وتی کا چہرا غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ بولی۔ "جیون! ثبوت کے بغیر کسی پر الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

جیون بولا۔ "روپ، آپ فکر نہ کریں۔ میں ثبوت پیش کروں گا اور وہ ثبوت آپ کے ساتھ ساتھ پولیس کی آنکھیں بھی کھول دے گا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ اس حویلی میں کیا کھیل کھیلا گیا ہے اور کس نے کھیلا ہے بس دو دن انتظار کیجئے۔ اُس مردود، اسکول ماسٹر کا اصل چہرہ آپ کے سامنے آجائے گا۔"

روپ وتی نے سیخ پا ہوکر کہا۔ "دیکھئے جیون صاحب! اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی

ہے۔ اگر اب آپ نے نوشاہ بھائی کے خلاف ایک لفظ منہ سے نکالا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

جیون کچھ دیر گہری نظروں سے روپ وتی کے شعلہ فشاں جسم کے نشیب و فراز دیکھتا رہا پھر بولا۔ "بڑی ہمدردی ہے آپ کو اپنے نوشاہ بھائی سے!" اس نے ہمدردی کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا تھا۔

روپ وتی نے بے باکی سے کہا۔ "ہاں..... ہے ہمدردی۔ اس لئے کہ اُن سے ہمیشہ زیادتی ہوئی ہے۔ پہلے پتاجی کی طرف سے، پھر دیدی کی طرف سے اور اب آپ لوگوں کی طرف سے۔ اُن کا دوش..... اُن کا دوش صرف اتنا ہے کہ وہ غریب اور خود دار ہیں اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتے تھے..... اس حویلی نے ہمیشہ انہیں دکھ دیئے ہیں اور سازشوں کا شکار بنایا ہے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ یہ سازشیں ہم کررہے ہیں؟"

روپ وتی بولی۔ "معاف کیجئے۔ میں آپ کی طرح بغیر ثبوت کے کسی کو دوشی ٹھہرانا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے کہ ہم سب وقت کا انتظار کریں اور دیکھیں کیا سامنے آتا ہے۔"

جیون نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "کم از کم اپنے نوشاہ بھائی کے بارے آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ "ثبوت" کے بعد بھی آپ کو اُن سے اتنی زیادہ ہمدردی رہتی ہے یا کچھ..... فرق پڑتا ہے۔"

روپ وتی کا جواب سنے بغیر جیون دروازے کی طرف بڑھا۔ میں جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہوگیا۔ وہ باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد میں نے ستون کی آڑ سے نکل کر دوبارہ کی ہول پر آنکھ رکھی۔ روپ وتی بستر پر اوندھی لیٹی تھی۔ مجھے صرف اس کا نچلا دھڑ نظر آرہا تھا۔ جسم کی جنبش اور سسکیوں کی مدھم صدا سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر مہمان خانے کی طرف چل دیا۔

محتاط قدموں سے راہداری پار کرکے میں برآمدے میں پہنچا۔ یہاں ایک دروازے پر موٹی سی زنجیر پڑی تھی۔ زنجیر سے ایک وزنی قفل منسلک تھا۔ یہ دروازہ دراصل بالائی

منزل پر جانے والی سیڑھیوں کا تھا۔ گابھا سنگھ کی پُراسرار موت کے بعد بالائی منزل پر جانے والے دونوں دروازے سیل کردیئے گئے تھے۔ دروازے پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے میں کھلے احاطے میں پہنچا تو ایک خوشخبری میری منتظر تھی۔ تھانے سے سپاہی لوٹ آیا تھا اُس کے ساتھ دو ہیڈ کانسٹیبل تھے اور وہ رپورٹیں بھی تھیں جن کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔

رپورٹیں وصول کرتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور سیل شدہ وزنی لفافے کھول کر بیٹھ گیا۔ قریباً تین گھنٹے پوری یکسوئی سے میں نے نتائج کا مطالعہ کیا۔ ان نتائج کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

"گابھا سنگھ کی موت رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان ہوئی۔ موت کی وجہ حرکتِ قلب کا بند ہونا تھی۔ اُس کے معدے اور انتڑیوں میں ایسے تیز اثر زہریلے مرکب کے اثرات پائے گئے۔ جس نے دورانِ خون اور دل پر فوری اثر کیا اور موت واقع کر دی' لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ متوفی کے قریب پڑی چائے میں زہریلا مرکب موجود نہیں تھا۔ کمرے میں موجود کھانے پینے کی کسی اور شے میں یہ زہر دریافت نہیں ہوا۔ جس سے رپورٹر نے یہ اندازہ لگایا تھا۔ متوفی کے جسم پر کہیں بھی تشدد کے نشان نہیں تھے۔ ماسوائے ان خراشوں کے جو اسے دروازے کے قریب گرنے سے آئیں۔ کمرے سے جو فنگر پرنٹس ملے ان میں گابھا سنگھ کے علاوہ ایک نامعلوم شخص کے پرنٹس بھی تھے "نامعلوم" اس لیے کہ یہ پرنٹس حویلی میں موجود کسی شخص کے پرنٹس سے نہیں ملتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ پرنٹس ان دو ملازموں میں سے کسی کے ہیں جو میری آمد سے قبل حویلی چھوڑ گئے تھے۔

ان رپورٹوں نے کیس کی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے کچھ اور الجھا دیا۔ جیساکہ ثابت ہوتا تھا مقتول کے معدے میں زہر کے اثرات تھے لیکن اگر واقعی اسے زہر دیا گیا تھا تو کیسے؟ کھانے پینے کی کسی شے میں زہر موجود نہیں تھا۔ پھر یہ کہ زہر کی واضح شناخت بھی نہیں ہو سکی تھی اور یہی بات معاملے کو پھر پُراسرار رنگ دے رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

دو روز بعد میری توقع کے عین مطابق ٹھاکر اور اس کے بیٹے جُگجیون نے اجے کمار کے خلاف ایک ٹھوس ثبوت میرے سامنے پیش کر دیا۔ یہ ثبوت ایک عورت کی شکل میں تھا۔ اس ملازمہ ٹائپ عورت کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ مہمان خانے کے ایک بند کمرے میں اس سے بات چیت ہوئی۔ ٹھاکر اور اس کا بیٹا بھی پاس ہی تھے عورت نے بتایا کہ وہ ارونا دیوی کی نوکرانی ہے۔ (ارونا' نرگس کی سہیلی تھی اور اسی سہیلی کے گھر اجے اور نرگس کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔) اجے بابو اور نرگس دو تین بار ارونا دیوی کے ہاں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ انہوں نے بند کمرے میں کافی وقت ایک ساتھ گزارا۔ پھر ایک روز نرگس بڑی پریشان حالت میں اس کے گھر آئی۔ اس نے ارونا دیوی کو روتے ہوئے بتایا کہ وہ اجے کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر پتا جی کو اس بات کا علم ہو گیا تو ایک طوفان آجائے گا۔ نرگس دیوی کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ سورگ باشی ٹھاکر صاحب بہت غصے والے آدمی تھے اولاد سے پیار کرتے تھے لیکن سختی بھی بہت تھی۔ انہیں معلوم ہوتا کہ نرگس نے چوری چھپے اپنے شوہر سے مل کر انہیں فریب دیا ہے اور اُن کی عزت کو بٹا لگایا ہے تو وہ طیش کے عالم میں اُسے جان دے مار دیتے اور شاید خود بھی آتما ہتھیا کر لیتے۔ ارونا دیوی نے سہیلی کی بپتا سنی تو پریشان ہوگئی۔ دونوں سہیلیاں برقعے اوڑھ کر "ناگر" گاؤں گئیں اور وہاں کے ڈاکٹر (کمپاؤنڈر) سے حمل ضائع کرنے والی گولیاں لائیں..... لیکن وقت گزر چکا تھا۔ اس دوائی سے نرگس دیوی کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگی۔ ایک روز میں نے نرگس دیوی کو ارونا دیوی سے کہتے سنا کہ اس نے یعنی نرگس نے اجے بابو کو سب کچھ بتایا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ ایک دو روز میں سارا معاملہ ٹھیک کر لیں گے..... اور اس بات کے صرف دو دن بعد ٹھاکر صاحب کا دھیانت ہو گیا۔ میں نے اس وقت بھی ارونا دیوی سے کہا تھا کہ کہیں یہ اجے کمار کا کام تو نہیں۔ میری بات سن کر ارونا دیوی گھبرا گئی تھیں اور انہوں نے مجھے جھڑک دیا تھا کہ تم خاموش رہو۔ ہمیں کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔"

عورت کی روئیداد مجھے گہری سوچ میں غلطاں چھوڑ گئی۔ یہ ایک بالکل نئی بات

سامنے آئی تھی کہ موت سے قبل نرگس امید سے تھی۔ اگر انا پرست ٹھاکر وشوانا تھ اس راز سے آگاہ ہو جاتا تو واقعی نیل پور میں زلزلہ آجاتا اور ہو سکتا ہے وہ آگاہ ہو گیا ہو اور اس کی اچانک موت کی وجہ بھی یہی ہو۔

میں نے ارونا کی ملازمہ سے کچھ اور سوال پوچھے جن سے پتہ چلا کہ اس میل ملاقات کی خواہش نرگس نے ظاہر کی تھی اور اس کی چھٹیوں پر اجے اس سے ملنے پہنچتا تھا۔ شوہر کی جدائی نے نوجوان ٹھاکرانی کو نیم جان کر رکھا تھا۔

ملازمہ کے بعد میں نے جگجیون سے پوچھا کہ اسے اس گواہ تک رسائی کیسے حاصل ہوئی۔ جگجیون نے جواب میں مجھے وہ گولیاں نکال کر دکھائیں جو اسے نرگس کے صندوق سے ملی تھیں۔ اس نے کہا۔

"میری ماتا نرگس دیدی کی چیزیں سنبھال رہی تھیں کہ ایک کپڑے کی تہہ سے یہ گولیاں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ یہ تمہاری بدنصیب دیدی کی دوائی صندوق سے نکلی ہے.....میں نے دوائی کا نام پڑھا تو حیران رہ گیا۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں ارونا کے گھر جا پہنچا اور وہاں اس ملازمہ سے ملاقات ہو گئی۔"

ٹھاکر دلجیت کمار نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! شریف شہری کا فرض ہوتا ہے کہ وہ قانون سے کوئی بات نہ چھپائے۔ ہم نے یہ فرض ادا کر دیا ہے اور اب امید کرتے ہیں کہ آپ کی راہ کچھ آسان ہو جائے گی' لیکن ہاتھ جوڑ کر آپ سے یہ بنتی کرتا ہوں کہ میرے سورگ باشی دوست کی عزت پر حرف نہ آئے۔ نرگس بیٹی کی بھول اگر اشتہار بن گئی تو ہم ڈوب مریں گے۔ میری بنتی ہے کہ اس ذکر کو اپنی رپورٹ میں جگہ نہ دیں۔"

میں نے گہری نظروں سے ٹھاکر کو دیکھا۔ اپنے مرحوم دوست اور منہ بولے بھائی کی نیک نامی کے لیے وہ بڑا فکر مند نظر آرہا تھا۔ مگر شاید..... اتنا فکر مند بھی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں متوفیہ نرگس کے بارے یہ باتیں کبھی نہ سُن سکتا۔ میں نے رسمی طور پر اقرار میں سرہلایا اور کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں پوری کوشش کروں گا....."

دلجیت کمار نے ملازمہ عورت کو اپنے بیٹے کے ساتھ باہر بھیج دیا اور رازداری سے

بولا۔ "انسپکٹر صاحب! ہو سکتا ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ اجے کمار جیسا بے ضرر سا شخص تین مرتبہ حویلی میں گھس کر اور دوسری منزل پر پہنچ کر قتل کیسے کر سکتا ہے؟ آپ کی سوچ بالکل درست ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ قتل اجے کمار نے تنہا نہیں کیے۔ اس کے لیے اس نے اپنے جگری یار گوجر سنگھ کو استعمال کیا ہے۔ گوجر سنگھ ایک سزا یافتہ شخص ہے اور کئی سنگین وارداتیں کر چکا ہے۔ آج کل وہ مفرور ہے لیکن اجے کمار اس کے ٹھکانے سے آگاہ تھا۔ اب میں آپ کو یہ اہم بات بتاتا ہوں کہ گوجر سنگھ کے بارے میں یہ تمام باتیں مجھے سب انسپکٹر گابھا سنگھ نے ہی بتائی تھیں۔ اس نے اسے قصبے میں کہیں گھومتے ہوئے پہچان لیا تھا اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا' مجھے پختہ یقین ہے کہ گابھا سنگھ کے قتل کی وجہ بھی یہی تھی..... یہ بات ہم نے آپ سے اب تک اس لیے چھپائی تھی کہ یہ دونوں ثبوت اکٹھے آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں....."

میں نے دلجیت کمار کی پوری بات سننے کے بعد دریافت کیا۔ "اب وہ مفرور گوجر سنگھ کہاں ہے؟"

دلجیت کمار نے کہا۔ "اس کے بارے تو آپ کو گابھا سنگھ ہی بتا سکتا تھا مگر افسوس....."

☆=======☆=======☆

حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ تین چار روز کے اندر اجے کمار کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا۔ ارونا کی ملازمہ کے بعد ارونا کو بھی اپنی سہیلی اور اس کے شوہر کے متعلق سچ بولنا پڑا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ملازمہ کا بیان درست ہے بلکہ وہ یہاں تک مان گئی کہ نرگس کو آخری دنوں میں شبہہ ہو گیا تھا کہ اس کے پتا کی موت میں اجے کا ہاتھ ہے۔ وہ اجے سے مل کر اپنا شبہہ رفع کرنا چاہتی تھی۔

اس بیان کے بعد سوچا جا سکتا تھا کہ اپنی موت کی رات نرگس' اجے سے ملنے کتاب خانے پہنچی ہو۔ کتاب خانہ ایسے رُخ پر واقع تھا کہ حویلی کی بیرونی دیوار پر چڑھنے والا شخص بہ آسانی کھڑکی کے راستے اندر آسکتا تھا۔ اجے کمار اسی راستے اندر آیا ہو۔ اس طرح

نرگس کو معلوم ہو گیا کہ اجے اس سے پہلے بھی کتاب خانے میں آچکا ہے۔ گفتگو کے دوران دونوں میں تلخ کلامی ہوئی ہو اور خود کو پھنستا دیکھ کر اجے نے نرگس کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔

اب میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ نیل پور سے واپس تھانے جاؤں اور وہاں حوالات میں بند اجے کمار سے پوچھ گچھ کروں' لیکن جب بھی میں اجے کمار کے مجرم ہونے کے بارے میں سوچتا نگاہوں میں روپ وتی کا غمگین چہرہ گھومنے لگتا۔ اس کی آواز کانوں میں گونجتی۔

"جگجیون صاحب! ایک شریف اور بے گناہ شخص کو رسوا کر کے آپ پتہ نہیں کون سا پُن کر رہے ہیں۔"

مجھے معاملے سے کسی سازش کی بو آنے لگتی اور میں بے اختیار سوچتا' اس گتھی کا سرا کہیں اور نہیں اس کتاب خانے میں ہے جہاں تینوں کی لاشیں پائی گئی ہیں۔ میرے اندر کا انسپکٹر مجھے ابھارتا کہ میں خدشات کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھوں اور دیکھوں کہ حویلی کی اوپری منزل پر کیا ہے؟

میں نے کبھی خود کو بہادر نہیں سمجھا مگر میں بزدل بھی نہیں..... پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ رات کی تاریکی میں حویلی کی بالائی منزل کا سوچتے ہی دل و دماغ پر سنسنی سی طاری ہو جاتی تھی۔ کرنے اور کہنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ ذرا تصور کریں' جس منحوس کمرے میں اوپر تلے تین افراد پُراسرار موت کا شکار ہو چکے ہوں وہاں رات گزارنا یا اس کے بارے سوچنا کتنا حوصلہ طلب ہے۔ اگر میں ایسا سوچ رہا تھا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی۔ میرا ذہن جھوٹے واہموں اور بے معنی تصورات سے پاک تھا۔ دل میں ایک ترنگ سی تھی کہ دیکھوں میرا یقین صحیح ہے یا لوگوں کا وہم سچ ہے.....

میں انہی سوچوں میں گم تھا رات کے گیارہ بج چکے تھے' اگلے روز مجھے نیل پور سے واپس روانہ ہونا تھا..... اچانک میں نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اپنی مسہری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کوٹ کی جیب میں وہ چار انچ لمبی چابی موجود تھی جس سے اوپری منزل تک

جانے والا راستہ کھل سکتا تھا۔ میں نے چابی لے کر گرم چادر کی بُکل ماری ریوالور لوڈ کر کے کمر سے باندھا' ایک ٹارچ ساتھ لی اور اللہ کا نام لے نکل کھڑا ہوا۔

☆=========☆=========☆

ہڈیوں تک اُتر جانے والی یخ ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ درمیانی راتوں کا چاند نہایت خاموشی سے حویلی کے شکستہ در و دیوار پر چمک رہا تھا۔ درختوں کے سائے جھوم جھوم کر پختہ صحن میں ناچ رہے تھے۔ میں بے آواز چلتا برآمدے میں پہنچا۔ واسکٹ کی جیب سے چابی نکالی اور تالے کے سوراخ میں ڈال دی۔ معمولی آواز سے تالا کھل گیا اور وزنی زنجیر میرے ہاتھوں میں جھولنے لگی۔ میں نے بہ آہستگی زنجیر دروازے سے جدا کی اور تالے سمیت فرش پر رکھ دی۔ پنڈتوں نے کالے رنگ کے کئی دھاگے اور ڈورے دروازے سے باندھ رکھے تھے۔ شاید اُن کا خیال تھا کہ اُن "پوتر" دھاگوں کی وجہ سے حویلی کا آسیب بالائی منزل تک محدود رہے گا۔ میں نے جیبی چاقو سے ان دھاگوں کو کاٹا اور دروازہ کھول کر زینے پر چڑھنا شروع کیا۔ بے آواز چلتا ہوا میں بالائی منزل پر پہنچا۔ دو عدد گیس لیمپ گہری تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ٹارچ جلالی اور اُس تاریک و طویل راہداری میں آگے بڑھنے لگا جس کے فرش پر سندھی ٹائلوں سے شطرنج کے خانے سے بنے ہوئے تھے اور جس کے آخری سرے پر کتاب خانے کا دروازہ تھا۔ راہداری کے عین وسط میں پہنچ کر دل و دماغ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس وقت میری چھٹی حس نے پکار کر کہا۔ "انسپکٹر نواز! یہ کیس اُن تمام کیسوں سے مختلف ہے جو تم آج تک حل کرتے آئے ہو۔ ان در و دیوار میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو تمہاری سمجھ سے باہر ہے....."

میں نے دل کڑا کر کے بہ آہستگی دروازہ کھولا اور کتاب خانے میں داخل ہو گیا۔ اندر گھستے ہی پرانی کتابوں کی مخصوص بُو ناک سے ٹکرائی۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ کتاب خانے کی مختلف اشیاء پر پڑ رہا تھا۔ معمولی کوشش سے میں شمعدان ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ ماچس بھی قریب ہی پڑی تھی۔ میں نے شمعدان کی چاروں موم بتیاں روشن کیں تو

کتاب خانے کی تاریکی کافی حد تک دور ہوگئی۔ چاروں طرف چھت گیر الماریاں پُراسرار پرچھائیوں کی طرح کھڑی تھیں۔ سامنے ہی سیاہ شیشم کی وہ میز نظر آرہی تھی جس پر ایک گیس لیمپ موجود تھا۔ وہ کرسی بھی پاس ہی پڑی تھی جس پر چند ماہ پہلے ٹھاکر وشواناتھ کی لاش پائی گئی تھی۔ میں نے گیس لیمپ روشن کردیا اور دروازہ اندر سے بھیڑ کر پلنگ پر نیم دراز ہوگیا۔ دیوار گیر کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور یہ خاموشی اعصاب پر عجیب طرح کا اثر کرتی تھی۔ کوئی نصف گھنٹہ میں اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر میز پر چلا گیا اور یونہی ایک کتاب کی ورق گردانی شروع کردی۔ اس شغل کو دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ میں نے عجیب سی کیفیت محسوس کی۔ بس ایک دم ہی سر چکرانے لگا۔ یوں جیسے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے اور دم گھٹ رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ ماحول کا اثر تھا۔ میں فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خالی جگہ میں ٹہلنے لگا۔ بار بار سر جھٹک کر میں نے اپنے حواس برقرار کرنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میرا سارا جسم پسینے میں تر تھا اور دل پر نامعلوم ہیبت طاری تھی۔ تاہم میں نے کمرہ نہیں چھوڑا اور اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ کلاک کی سوئیاں دھیرے دھیرے آگے کھسکتی رہیں۔ نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' کبھی بستر پر نیم دراز ہو جاتا اور کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا.....

آخر وہ پُرہول رات خیریت سے گزر گئی۔ دن کا اُجالا مشرقی کھڑکیوں سے اندر آیا تو آنکھیں نیند سے خود بخود بوجھل ہونے لگیں۔ پلنگ پر لیٹا لیٹا سوگیا..... دوبارہ آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ ٹھاکر دلجیت کمار' اُس کا بیٹا جگجیون' روپ وتی اور دوسرے ملازم میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ مجھے جاگتے دیکھ کر روپ وتی کا چہرہ کِھل اٹھا۔ خوبصورت آواز میں بولی۔

"انسپکٹر صاحب! آپ نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔ آپ کو ایسا خطرناک کام نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

میں نے کہا۔ "کام خطرناک ہوتا تو آپ لوگ مجھے زندہ نہ دیکھتے۔"

ٹھاکر دلجیت نے کہا۔ "نواز صاحب! آپ کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے..... بہرحال اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے..... آسیب کا یہ سارا ڈھونگ اجے ہی کا رچایا ہوا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھاکر صاحب! اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنا ٹھیک نہیں۔ رام رام کریں۔ ابھی صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی۔"

☆=======☆=======☆

اُسی روز میں تھانے واپس روانہ ہوگیا۔ سورگ باشی نرگس کا شوہر اور روپ وتی کا نوشاہ بھائی یعنی اجے ابھی تک جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ میں نے اُس سے ملاقات کرکے تفصیلی بات چیت کی۔ نرگس سے خفیہ ملاقاتیں' حمل ضائع کرنے والی گولیاں اور پھر ٹھاکر وشواناتھ اور نرگس کا قتل' سب کچھ زیرِ بحث آیا۔ اس طویل گفتگو کی تفصیل آپ کے لئے خشک ثابت ہوگی۔ مختصراً یہ کہ اجے سے بات چیت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کچھ بھی ہے یہ نوجوان ایک خونی قاتل نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک ہے حالات اُس کے خلاف جاتے تھے لیکن یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا۔

تفتیش کے دوران ایسے مواقع آتے ہیں جب تفتیش کرنے والے کو اپنا کام آسان بنانے کے لئے کچھ لوگوں کو شک سے آزاد کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح تفتیش کے ایک دو راستوں کو بند کرکے باقی راستوں پر زیادہ توجہ دی جاسکتی ہے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے اجے کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا لیکن یہ رہائی بالکل غیر مشروط نہیں تھی' میں اُس کی نگرانی کرانا چاہتا تھا..... جب اُس کی ضمانت ہوگئی تو میں نے اپنے خاص مخبر انور کو اُس کے پیچھے لگادیا۔ انور کی ذمے داری تھی کہ وہ اجے پر زیادہ سے زیادہ نگاہ رکھے اور معلوم کرے کہ وہ کن لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔

اس کام سے فارغ ہوکر میں واپس نیل پور حویلی پہنچ گیا۔ حویلی پہنچتے ہی ٹھاکر دلجیت سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بے چینی سے بیرونی پھاٹک پر ٹہل رہا تھا کہنے لگا۔

"اچھا ہوا نواز خاں! تم آگئے ورنہ آج میں تمہارے پاس پہنچ جاتا۔"

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ آپ پریشان ہیں۔"

وہ بولا۔ "انسپکٹر' میری پریشانی کو تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو' جیون کی ماتا سخت خوفزدہ ہیں۔ وہ چاہتی ہیں جتنی جلد ممکن ہو ہم یہ حویلی چھوڑ جائیں۔ نوکروں چاکروں کے چلے جانے کے بعد وہ اور بھی خوفزدہ رہتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ پرانے زمانے کی عورت ہیں آپ انہیں سمجھائیں بجھائیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ کم از کم آپ تو یہ سمجھتے ہیں نا کہ آسیب وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔"

دلجیت بولا۔ "تمہاری بات ٹھیک ہے انسپکٹر' لیکن ہماری مجبوری ہے ہمیں روپ وتی اور جیون کی منگنی کرنی ہے اور یہ تقریب اس حویلی میں عجیب سی لگے گی۔"

میرے لئے یہ انکشاف تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کب ہو رہی ہے یہ منگنی؟"

دلجیت بولا۔ "بس یہی دو تین ہفتوں میں۔"

یہ ٹھاکروں کا نجی معاملہ تھا' لہٰذا میں نے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے مجھے معلوم تھا کہ روپ وتی دونوں باپ بیٹے کو اچھا نہیں سمجھتی بلکہ اُسے یہاں تک شبہہ ہے کہ اُس کے باپ اور بہن کی موت میں اُن دنوں کا ہاتھ ہے۔ پھر وہ منگنی پر راضی کیسے ہوئی۔ میں نے روپ وتی سے ملنا ضروری سمجھا۔

اُس سے میری ملاقات اگلے روز علی الصبح ہوئی۔ میری طرح وہ بھی بہت جلدی جاگنے کی عادی تھی۔ میں مہمان خانے سے چہل قدمی کے لئے نکلا اور حویلی کے بائیں باغ میں آگیا۔ روپ وتی وہاں سے پہلے ٹہل رہی تھی۔ حویلی کے باقی مکین ابھی گہری نیند سو رہے تھے۔ روپ وتی نے خوش اخلاقی سے نمستے کیا۔ ہم دونوں درختوں کے پاس ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے روپ وتی کی منگنی کی بات چھیڑ دی۔ اُس کے دلکش چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آئے۔ آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

"آپ سے کس نے کہا تھا کہ منگنی ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے تایا جان نے۔"

وہ بے قراری سے بولی۔ "حیرت کی بات ہے۔ میرے ساتھ اُن کی مختصر سی بات ہوئی تھی اور میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ اُن کے زیادہ اصرار پر میں نے کہا تھا کہ میں خالہ کو خط لکھوں گی جو بھی فیصلہ ہوگا اُن کے آنے پر ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کی یہ خالہ کہاں رہتی ہیں؟"

روپ وتی نے جواب دیا۔ "مدراس میں۔ قریبی رشتے داروں میں اب اُن کے سوا میرا اور کوئی نہیں۔"

میں نے موضوع بدل کر کہا۔ "روپ وتی! ذاتی سی بات ہے لیکن آپ سے بڑا ہونے کے ناطے میں پوچھ سکتا ہوں..... کیا آپ جیون سے بیاہ کرنا چاہتی ہیں؟"

ایک مشرقی لڑکی کی طرح یکایک روپ وتی کی پلکیں جھک گئیں اور چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی لیکن اس سرخی میں چاہت کی آمیزش نہیں' انکار کی بے رخی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر بولی۔ "نواز صاحب! میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرے پتاجی کی یہ خواہش ضرور تھی مگر انہوں نے کبھی مجھ پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسی۔"

میں روپ وتی کا جواب سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ "دیکھیں روپ وتی! زندگی آپ کو گزارنا ہے اور اس کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کریں۔ جب تک میں یہاں موجود ہوں کوئی آپ پر زبردستی نہیں کر سکتا۔"

روپ وتی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں امید اور حوصلے کے دیئے روشن ہوگئے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "زندگی انسان کو ایک بار ملتی ہے اور اُسے کسی چاچے تائے یا ماموں پھوپھا کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ ساری عمر رونے اور سسکنے سے بہتر ہے کہ آدمی ایک ہی بار حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرلے۔"

میری باتوں نے روپ وتی کے چہرے پر عجیب سا رنگ لہرا دیا۔ مجھے وہ سہانے سپنے دیکھتی ہوئی کسی قدیم مندر کی سندر دیو داسی لگی۔

کچھ دیر مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ حویلی کی طرف چلی گئی میں بھی اُٹھ کر

مہمان خانے کی طرف ہولیا۔ اچانک میری نظر ایک کتاب پر پڑی۔ یہ کتاب کچھ دور ایک پتھر پر رکھی تھی۔ غالباً روپ وتی پڑھنے کے لئے لائی تھی مگر میرے ساتھ باتوں میں اُلجھ کر یہیں بھول گئی۔ میں نے یونہی کتاب اُٹھالی۔ کھول کر دیکھا' یہ کوئی انگریزی ناول تھا۔ محبت کے موضوع پر۔ نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ناول کے صفحوں کے درمیان ایک تہہ شدہ سفید کاغذ پڑا تھا۔ اس پر روپ وتی کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ میں ہندی کی یہ تحریر پڑھنے لگا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"محبت ایک پھل ہے' جو سوچ کی شاخ پر لگتا ہے۔ ہجر کی دھوپ اور سپنوں کی چاندنی اسے پکاتی ہے اور جب یہ پکتا ہے تو اس کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ میرے بدن کا پیڑ بھی اس پھل کے بوجھ سے جھکتا جارہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں اتنی بے قرار رہتی ہوں میں؟ کیوں خواب بُنتی رہتی ہوں۔ کیا وہ بھی میرے دل کی حالت سے آگاہ ہیں۔ کیا انہوں نے بھی کبھی ہوا سے سرگوشیاں سنی ہیں؟ میں کچھ نہیں جانتی' صرف اتنا معلوم ہے کہ مجھے اپنے بدن سے اُن کی مہک آتی ہے۔"

اس پیرے کو ایک دفع پڑھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ روپ وتی کسی کی الفت کا شکار ہے اور یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ اُس کی تعلیم نے اُسے شعور دیا تھا اور وہ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا' وہ کون شخص ہے جو روپ وتی کے خیالوں میں بستا ہے۔ شاید کالج کے زمانے کا ساتھی یا کوئی دور کا رشتے دار بہرحال وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔

انہی خیالوں میں مگن میں اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اچانک ذہن میں بجلی سی لہرا گئی۔ میرے کانوں میں روپ وتی کے ہونے والے منگیتر مُجگیون کے الفاظ گونجے۔ "بہت ہمدردی ہے آپ کو اپنے نوشاہ بھائی سے۔" یہ الفاظ اُس نے روپ وتی سے کہے تھے' اُس کی خوابگاہ میں۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر یہ سب کچھ سنا تھا۔ اب مجھے ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ "بہت ہمدردی ہے آپ کو اپنے نوشاہ بھائی سے!" مُجگیون کے الفاظ میں چھپا ہوا طنز میں نے اُس وقت بھی محسوس کیا تھا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ

روپ وتی اپنے بہنوئی سے چاہت رکھتی ہو؟ میں دیر تک اس سوال پر غور کرتا رہا لیکن کسی آخری نتیجے تک نہیں پہنچ سکا۔

دوسرے یا شاید تیسرے روز کی بات ہے' میں مہمان خانے کے کمرے میں بیٹھا اپنے اے ایس آئی کرم چند کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے میں نے گاؤں کے ایک دو مشتبہ افراد کو لے کر آنے کی ہدایت کی تھی۔ کافی انتظار کے باوجود کرم چند تو نہیں آیا مگر انور آگیا۔ اس نے ایک گرم چادر کی بُکل اس طرح مار رکھی تھی کہ چہرہ بڑی حد تک چھپ گیا تھا۔ حویلی کے دروازے پر میرا اپنا سنتری تھا ورنہ انور اتنی آسانی سے اندر نہ آسکتا۔ کمرے میں پہنچے ہی اس نے چادر اتار پھینکی اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

"خان صاحب! ایک گرما گرم چائے تو پلائیں۔" اس نے ٹانگیں پھیلا کر فرمائش کی۔

اس کے نخرے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔ بہرحال چائے کے دو بڑے پیالے پی کر اس کی طبیعت میں ذرا سرشاری آئی اور وہ اصل موضوع پر آگیا۔ اس نے کہا۔

"خان صاب! رات ایک لڑکی' اجے سے ملنے آئی تھی میرا خیال ہے وہ اسی حویلی سے گئی تھی۔ اس کا نام روپ ہے۔"

روپ وتی کا نام سن کر میں چونک گیا۔ میں نے کہا۔ "پورا واقعہ تفصیل سے بتاؤ۔"

انور نے کہا۔ "اجے کے گھر کے عین سامنے ایک حلوائی کی دکان ہے میں نے اس سے یاری گانٹھی ہوئی ہے۔ کل رات کوئی آٹھ بجے میں وہاں بیٹھا تھا کہ اجے گھر سے نکلا اور خاموشی سے ایک طرف چل دیا۔ میں بھی کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ اجے نے کھیس کی بُکل ماری ہوئی تھی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ قصبے کی مختلف گلیوں سے ہو کر وہ کھیتوں میں آگیا اور چوہدریوں کے باغ میں پہنچ گیا۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ کافی دیر تک جب وہ باہر نہیں نکلا تو دل کڑا کر کے میں نے بھی باغ میں قدم رکھا۔ اچانک مجھے جھاڑیوں سے باتوں کی مدھم آواز آئی۔ احتیاط سے چلتا میں اس جگہ پہنچا تو اجے کو کسی لڑکی

سے باتیں کرتے پایا۔ وہ خوبصورت تھی اور اس نے زرد رنگ کا پھولدار کُرتہ پہن رکھا تھا۔

اجے نے کہا۔ "روپ وتی آپ کو ایسے نہیں آنا چاہئے تھا۔"

لڑکی بولی۔ "شاید میں نہ آتی لیکن آپ کو پیغام بھیج چکی تھی اس لیے وعدہ خلافی ٹھیک نہیں سمجھی۔"

اجے نے کہا۔ "جو بھی کہنا ہے جلدی کہہ لیں۔ یہ نہ ہو میرے لیے کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے۔"

روپ وتی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ نردوش ہیں بھگوان قسم' اگر ساری دنیا بھی آپ کو دوشی ٹھہرائے تو میرے من کو یقین رہے گا کہ دنیا جھوٹ بول رہی ہے۔ اجے! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ اپنی طرف سے بھی اور اپنی دیدی کی طرف سے بھی۔ ہم سب نے مل کر آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کا اپمان کیا ہے۔ مجھے وہ الفاظ نہیں سُوجھ رہے جن میں آپ سے معافی مانگ سکوں۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ پتا جی' آپ کے اور دیدی کے درمیان دیوار نہ بنتے اور اگر وہ دیوار بنے ہی تھے تو دیدی میں اتنی ہمت ہوتی کہ دلیری سے اپنے پتی کا ساتھ دے سکتیں....."

اجے نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "روپ! پرانی باتوں کے ذکر سے کیا فائدہ ماضی کے بارے تو آدمی اس وقت سوچتا ہے جب حال کے مسائل سے فرصت ہو۔"

روپ وتی نے کہا۔ "ہاں میں جانتی ہوں کہ تایا دلجیت اور جگجیون آپ کو تہرے قتل کے مقدمے میں مجرم ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں..... میں رات دن آپ کی فکر میں رہتی ہوں لیکن کچھ بھی ہے' عورت ہوں کیا کر سکتی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں کہ تایا دلجیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کروں لیکن اس میں پتا جی کی بدنامی کا خطرہ ہے اور پھر مجھ پر بھی حرف آئے گا کہ پتا کے منہ بولے بھائی اور اپنے سرپرست سے برا سلوک کر رہی ہوں۔"

اجے نے کہا۔ "روپ وتی! تمہیں برا لگے یا اچھا۔ میں صاف صاف کہوں گا کہ ٹھاکر

صاحب' نرگس اور سب انسپکٹر کی موت میں تمہارے تایا اور اس کے بیٹے کا ہاتھ ہے۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تو واقعات کا ہر ہر موڑ ان دونوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ "ٹھاکر صاحب" کے قتل کے بعد دلجیت کمار جائیداد کے بڑے حصے کا مالک تو بن ہی چکا ہے اب وہ تمہاری شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کر کے باقی کا حصہ بھی ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ ایک نہایت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے۔"

روپ وتی کی آواز آئی "اجے! میں پاگل ہو جاؤں گی مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔ آخر تین قتل ہوئے ہیں۔ کوئی ٹھوس ثبوت تو ملنا چاہئے ان جرائم کا۔ میں اپنے پیاروں کا خون کس کے ہاتھ پر تلاش کروں ..... کس کے ہاتھ پر تلاش کروں۔" اجے کچھ دیر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔ دس پندرہ منٹ مزید بیٹھ کر روپ وتی درختوں سے نکلی اور چادر میں لپٹی لپٹائی گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد اجے بھی درختوں سے برآمد ہوا اور ایک دوسرے راستے سے قصبے کی طرف روانہ ہو گیا....."

اپنی رپورٹ سنا کر انور نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس نے واقعی اہم کامیابی حاصل کی تھی۔ میں نے اسے چائے کا ایک بڑا پیالہ اور پلایا اور خرچ پانی دے کر واپس اجے کی طرف روانہ کر دیا۔

☆=========☆=========☆

تاریکی دھیرے دھیرے حویلی کے خاموش در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ مہمان خانے کی کھڑکیوں سے میں بالائی منزل کی کھڑکیاں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اونچی اونچی محرابی کھڑکیاں جن پر رنگین شیشے جڑے تھے اور اندر کی طرف دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ انہی کھڑکیوں کے پیچھے تین انسانوں کو یکے بعد دیگرے موت کے فرشتے نے دبوچا تھا۔ ان پر کیا بیتی؟ یہ صرف وہی بتا سکتے تھے لیکن ان کا بیان لینے کے لیے موت کی وادی کا سفر ضروری تھا اور اس سفر سے واپس کون آیا ہے۔ وہاں کے بیان وہیں رہتے ہیں اور سزا جزا کا عمل بھی اوپر ہی انجام پاتا ہے..... میرے خیالات کی رو روپ وتی کی طرف مڑ گئی۔ انور کی رپورٹ کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ روپ وتی اجے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

گو' اجے سے ملاقات میں اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی مگر اس کی جو تحریر میری نظر سے گزری تھی وہ اگر اجے ہی کے لیے تھی تو ساری حقیقت سامنے آجاتی تھی۔ اب یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ دلجیت اور اس کا بیٹا جیون' اجے کو پھنسانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ درحقیقت انہیں شبہہ ہو چکا تھا کہ روپ وتی دل ہی دل میں اجے سے پیار کرتی ہے اور ہو سکتا ہے آگے چل کر اجے ایک بار پھر ٹھاکروں کا داماد بن جائے۔ اجے کو مشتبہ ٹھہرا کر وہ ایک طرف اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنے مبینہ جرائم پر پردہ ڈال رہے تھے۔ میں اسی موضوع پر سوچ رہا تھا جب پائیں باغ میں ایک ہیولا سا گھومتا ہوا نظر آیا۔ لہراتے آنچل سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ روپ وتی ہی ہے۔ اس کا اس وقت یوں گھومنا خلافِ معمول تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ مجھ ہی سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو۔ ہماری آخری بات چیت ٹھیک اسی جگہ ہوئی تھی۔ سلیپر پہن کر میں کمرے سے باہر نکل آیا اور محتاط انداز سے پائیں باغ کی طرف بڑھا۔ مہمان خانے اور پائیں باغ کے درمیان گارڈینا کی تین فٹ اونچی باڑ حد بندی کا کام دیتی تھی۔ باغ میں داخل ہونے کے لیے باڑ ہی کو جنگلے پر چڑھا کر خوبصورت سا دروازہ بنا دیا گیا تھا۔ میں جب اس دروازے کے پاس پہنچا تو مجھے ٹھٹک کر ایک بڑے مور پنکھ کی آڑ میں ہونا پڑا۔ ٹھاکر دلجیت کمار سفید پائجامے قمیض میں ملبوس تیز تیز قدم اٹھاتا روپ وتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اوہ روپ!" اس کی فرمائشی آواز سنائی دی۔ "اب جانے بھی دو غصہ۔ جیون بھی بغیر کچھ کھائے ہی سو گیا ہے' چلو معاف کر دو اسے۔ اس کی جگہ میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

روپ وتی کی طرف سے خاموشی رہی۔ ٹھاکر کی آواز دوبارہ آئی۔ "میں مانتا ہوں کہ اس کی غلطی ہے۔ منگنی کے کارڈ چھپوانے سے پہلے اسے کم از کم مجھ سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ خیر اب جو بھی ہو گیا..... چلو اب اندر چلو اور کھانا کھاؤ۔ کوئی کام تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں اپنی بیٹی سے۔"

روپ وتی کے سسکنے کی آواز آئی۔ بہرحال دلجیت کمار اسے بہلا پھسلا کر اندر لے گیا۔

اس کا مطلب تھا معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ دلجیت کمار جلد از جلد روپ وتی کو رشتے کے بندھن میں باندھ لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ اس معاملے میں روپ وتی پر سختی کرنے سے بھی نہ چوکتا' مگر چونکہ میں ابھی حویلی میں موجود تھا لہٰذا وہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک طرح میں اس کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا ورنہ وہ کب کا حویلی بیچ کر یا چھوڑ کر کہیں اور جا چکا ہوتا اور روپ وتی مکمل طور پر اس کے بس میں ہوتی۔

دلجیت کمار اور جگ جیون پر جلد از جلد ہاتھ ڈالنا اب ضروری ہو گیا تھا مگر مسئلہ ٹھوس ثبوت کا تھا۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر مکمل کیا گیا چالان' عیار ٹھاکر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اور یہ کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ٹھاکر چونکہ بیٹے کی شادی مرحوم کی بیٹی سے کر رہا ہے اس لیے وہ مجرم ہے۔ تینوں بار موقعۂ واردات سے باپ بیٹے کی غیر موجودگی بھی ثابت ہوئی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی کسی خاص طرف اشارہ نہیں کر سکی تھی۔

اگلے روز کی بات ہے مجھے اپنے انگریز ایس پی کی طرف سے ایک پیغام ملا۔ یہ پیغام ایک سب انسپکٹر لایا تھا۔ سب انسپکٹر نے ایک بند لفافہ مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ ایس پی صاحب کو یہ گمنام خط کسی نے نیل پور سے بھیجا ہے۔ میں نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا۔

"محترم و معظم جناب ایس پی صاحب! اپنا نام ظاہر کئے بغیر میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا عملہ جو انسپکٹر نواز خاں اور ساتھیوں پر مشتمل ہے نیل پور میں ایک مہینے سے پکنک منا رہا ہے لیکن کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکا۔ اب تو قصبے کے لوگ ان سے تنگ آگئے ہیں سارا دن خواہ مخواہ لوگوں کو دھمکاتے رہتے ہیں اور نچلے درجے کے ملازمین عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی سے بھی نہیں چوکتے۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے ان

لوگوں سے کوئی کام لیجئے یا نہیں واپس بلا لیجئے۔ سارے قصبے میں یہ بات مشہور ہے کہ حویلی میں ہونے والے تینوں قتل ٹھاکر کے داماد اجے نے اپنے اشتہاری دوست گوجر سنگھ کے ہاتھوں کروائے ہیں۔ گوجر سنگھ مفرور ہے اور کئی اور لوگوں نے اسے علاقے میں دیکھا ہے مگر آپ کے انسپکٹر نواز خاں نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اسے غریب دیہاتیوں کو تنگ کرنے کے سوا کوئی کام نہیں....."

پوار خط پڑھنے کے بعد میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اسی وقت ایک جوابی لفافہ ایس پی صاحب کے نام لکھا۔

"جناب! میں سمجھ گیا ہوں یہ گمنام خط کس نے لکھا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ جہاں تک گوجر سنگھ کا تعلق ہے اس کے متعلق میں نے پوری تحقیق کروائی ہے اور اس حوالے سے ایک دلچسپ اطلاع میرے پاس ہے۔ مسمی اجے کمار کے مخالف اسے گوجر سنگھ کے نام سے بدنام کر رہے ہیں لیکن شاید انہیں بھی معلوم نہیں کہ گوجر سنگھ بیچارہ آج سے کوئی نو ماہ پہلے بھینس کی ٹکر لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے پوری چھان بین کرائی ہے۔ یہ واقعہ بیس پچیس کوس دور ایک گاؤں کا ہے جہاں وہ چمار کے بھیس میں چھپا ہوا تھا۔ ایک روز زیادہ شراب پی کر اس نے بھینس کے بوسے لینے شروع کر دیے اور اسے میری رانی کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ بھینس نے طیش میں آکر اسے ٹکر رسید کی جو عین اس کے دل پر لگی اور وہ چل بسا۔ میں واپسی پر آپ کو گوجر سنگھ کی رپورٹ دوں گا۔ اگر ہم یہاں پکنک منا رہے ہیں تو سمجھئے کہ یہ پکنک مجرموں کے سینے پر منائی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد میں اچھی خبر لے کر آؤں گا۔ تھوڑا انتظار فرمائیے۔" یہ خط لکھ کر میں نے سب انسپکٹر کے حوالے کر دیا اور اسے واپس بھیج دیا۔

☆=======☆=======☆

دو روز بعد کی بات ہے' شام ہی سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ رات نو بجے تک تیز بارش شروع ہو گئی۔ ساتھ یخ بستہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ سردی میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ میں مہمان خانے کے بڑے کمرے میں عموماً دس ساڑھے دس بجے تک

ساتھیوں سے تبادلہ خیال کرتا رہتا تھا مگر اس روز جلدی سونے کے لیے چلا گیا۔

لیمپ بجھا کر لیٹ گیا۔ آتشدان کی مدھم روشنی میرے چمکدار لحاف پر منعکس ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں پر شاہ بلوط کے لمبے سائے جھوم کر ماحول کو اور بھی خوفناک بناتے تھے کبھی کبھی بارش کا زبردست تریڑا کھڑکی کے شیشوں پر پڑتا اور یوں لگتا پانی کھڑکی توڑ کر اندر آجائے گا۔ حویلی میں گاہے گاہے بھونکنے والے کتے بھی آج خاموش تھے۔ میں کچھ دیر موسم کی شدت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر لحاف اور آتشدان کی گرمی نے آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا' اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے ہاتھ کی پشت پر کسی گیلے پن کا احساس ہوا تھا۔ آتشدان بجھ چکا تھا اور کمرے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ باہر بارش کا سلسلہ شدت سے جاری تھا۔ میں نے سرہانے پڑے لیمپ کو روشن کیا اور بری طرح چونک گیا میرے چمکدار لحاف کے اوپر خون کا ایک دھبہ نظر آرہا تھا۔ یہ دھبہ سگریٹ کی ڈبیا کے برابر تھا اور بالکل تازہ تھا۔ تب میری نگاہ اپنے ہاتھ پر پڑی اور وہاں بھی خون نظر آیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید سوتے میں کسی چیز سے ہاتھ زخمی کر لیا ہے اور لحاف پر اسی زخم سے دھبہ لگا ہے مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ہاتھ پر کوئی زخم نہیں..... کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں نے اٹھ کر شمعدان کو روشن کر لیا اور اچھی طرح کمرے کا جائزہ لیا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لحاف پر یہ دھبہ پہلے سے موجود تھا۔ شاید بلی کی دست درازی کا شکار کوئی چوہا لحاف پر گرا تھا اور یہ دھبہ چھوڑ گیا تھا۔ فضول واہموں کو ذہن سے نکال کر میں نے لیمپ اور شمعدان بجھائے اور دوبارہ لحاف میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد پھر نیند نے آدبوچا۔ اس دفعہ آنکھ بجلی کے خوفناک کڑاکے سے کھلی تھی۔ شاید نزدیک ہی کسی پیڑ یا ٹیلے پر بجلی گری تھی۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کا ریڈیم ڈائل آنکھوں کے سامنے کیا تو کسی سیال کا قطرہ میری کلائی سے پھسل کر گردن پر گرا۔ دفعتاً مجھے کمرے میں کسی عجیب بو کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے لیمپ قریب کر کے اس کی لَو اونچی کی لیمپ کی شفاف چمنی نے سارا کمرہ روشن کر دیا۔ اور اس وقت

میرے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لحاف پر خون کے پہلے دھبے کے ساتھ اور بھی بہت سے دھبے موجود تھے..... اور اب یہ دھبے صرف لحاف پر ہی نہیں تھے' کمرے کی ہر شے پر تازہ تازہ سرخ خون نظر آرہا تھا۔ چند لمحے کے لیے مجھے اپنی بیداری کا یقین نہیں آیا۔ میں جلدی سے لحاف پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری نظر فوراً چھت کی طرف گئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لکڑی کی چھت سے مسلسل خون کی بوندیں گر رہی ہیں۔ تختوں کے درمیان موجود درزوں سے خون بروزے کی طرح رِس رہا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا۔ حویلی کی دوسری منزل پر کوئی خون ہو گیا ہے..... مگر اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس بحال کرکے کوئی قدم اٹھاتا' ایک اور سنگین واقعہ رُونما ہوا۔ اچانک سامنے کھڑکی پر ایک انسانی سایہ لہرایا اور ایک جلتی ہوئی مشعل شیشہ توڑ کر اندر آگری۔ یہ مشعل میز پر گری اور اس کی چکنی سطح سے پھسل کر بستر پر آرہی تھی۔ بستر کی مہین ریشمی چادر اور تکیے نے پلک جھپکتے ہی آگ پکڑ لی اور یکایک میرا پورا بستر جلنے لگا۔

میری جگہ کوئی بھی ہوتا چند لمحوں کے لیے ضرور سکتے میں رہ جاتا' میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مگر میں نے حتی الامکان تیزی سے خود کو سنبھالا اور لپک کر کھڑکی سے ٹوٹے شیشے تک آیا۔ میری نظر مہمان خانے کے برآمدے کی طرف گئی۔ ایک سایہ گملوں کو پھلانگتا تیزی سے پائیں باغ کی طرف لپک رہا تھا۔ میں نے ہولسٹر سے ریوالور کھینچا اور دروازہ کھول کر ننگے پاؤں سایے کے پیچھے بھاگا۔ بارش موسلا دھار' اور سردی بلا کی تھی مگر اس وقت ان چیزوں کا خیال کسے تھا۔ میری نگاہ سائے پر جمی [illegible] اور قدم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں جان پر کھیل کر بھی اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ دیکھ کر تمام خدشے اور وسوسے خود بخود پسپا ہو گئے تھے۔ سائے نے گارڈینا کی تین فٹ اونچی باڑ پھلانگی اور باغ میں داخل ہو گیا۔ اب اسے بھی علم ہو چکا تھا کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ چھلاوے کی طرح وہ پائیں باغ کے بغلی دروازے سے نکلا اور بیرونی پھاٹک کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنی پوری قوت سمیٹ کر درمیانی فاصلہ کم کرنے کی کوشش کی اور اس سے دس

پندرہ گز کی دوری پر پہنچ گیا۔ "رک جاؤ!" میں پکارا۔ پھر اس کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کیا مگر بارش سے پستول میں کوئی خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ اس دوران سائے نے اچھل کر ایک چھوٹی سے حد بندی پار کی اور اس کی جیب سے کوئی دھات کی بنی ہوئی شے نکل کر فرش پر گری۔ وہ سیدھا بھاگتا چلا گیا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔ پھاٹک پر موجود سنتری بھی جو شاید اونگھ رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلے مجھے رائفل کی زد پر لے لیا پھر جب قریب پہنچ کر میں نے ایک جھاڑ پلائی تو وہ حواس میں آیا۔ اگر وہ چوکنا ہوتا تو مجرم اتنی آسانی سے فرار نہ ہو سکتا۔

دوسری طرف میرے کمرے کی جانب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میرا عملہ جو ساتھ والے کمرے میں سو رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اور اب وہ سب آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ بارش کی تیز بوچھاڑ بھی ان کی مدد کر رہی تھی۔ اتنے میں حویلی کے اکا دکا ملازم بھی بھاگتے ہوئے پہنچ گئے۔ آگ پھیلنے سے پہلے ہی آگ پر قابو پا لیا گیا۔ تاہم میرا تین چوتھائی بستر اور دو کھڑکیوں کے پردے جل کر راکھ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر دلجیت اور روپ وتی وغیرہ بھی ہانپتے کانپتے پہنچ گئے۔ میں نے ٹھاکر دلجیت کے کئی ایک سوالوں کے جواب میں کہا۔

"میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا' فی الحال بالائی منزل پر چلیے۔ میرا خیال ہے کوئی ڈرگھٹنا ہو گئی ہے۔" روپ وتی اور دلجیت کے چہرے خوف کی آماجگاہ بن گئے۔ وہ میرے چہرے اور کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھ چکے تھے۔ فوراً ٹارچیں منگوائی گئیں۔ دھڑکتے دل اور محتاط قدموں سے ہم زینے طے کرنے لگے۔ میں سب سے آگے تھا۔ پیچھے میرے عملے کے چھ مسلح نوجوان تھے عقب میں ٹھاکر دلجیت' روپ وتی اور دو ملازم تھے۔ آخر میں پھر دو مسلح کانسٹیبل تھے۔ مقفل کتاب خانے کے سامنے سے گزر کر ہم مشرقی حصے میں آئے' اور آخر ایک بڑے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہی وہ کمرہ تھا جو میرے کمرے کے عین اوپر واقع تھا۔ دلجیت کمار نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ جیب سے ایک چابی نکالی اور کمرے کا قفل کھول دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کو دھکیلا اور میری

ٹارچ کی روشنی کمرے پر پڑی..... اندر کا منظر عجیب و غریب تھا۔ روپ وتی کے ہونٹوں سے "اوہ مائی گاڈ" کے الفاظ نکل گئے۔ دلجیت کمار بھی "ہرے رام ہرے رام" کی گردان کرنے لگا۔ فرش پر ایک موٹی تازی بالکل سیاہ بکری کی لاش پڑی تھی۔ بکری کے چاروں پاؤں میں گھنگرو تھے اور یہ گھنگرو ویسے ہی تھے جیسے طوائفیں پہنتی ہیں۔ بکری کا سر غائب تھا اور گردن سے گاڑھا خون بہہ کر پورے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ دلجیت کمار کا ایک ملازم اتنا خوفزدہ ہوا کہ چیخیں مارتا ہوا نیچے گر گیا۔ اسے مرگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

☆=========☆=========☆

اگلی رات کا ذکر ہے۔ میری دستی گھڑی نے رات کے گیارہ بجائے' تو میں نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے بستر سے اٹھا اور جیون سے دو دو ہاتھ کرنے چل دیا۔ درحقیقت مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ رات کا سارا ڈرامہ جیون ہی کا کھیلا ہوا ہے۔ وہ خود کو بہت چالاک اور دوسروں کو نرا گدھا سمجھتا تھا۔ مگر قدرت نے خود اس کے خلاف ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ کل رات بھاگتے ہوئے اس کی جیب سے کوئی چیز گر گئی تھی۔ یہ دراصل ایک چابی تھی۔ میں نے رات پچھلے پہر جا کر یہ چابی ڈھونڈ لی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ چابی کس تالے کی ہو سکتی ہے۔ اچانک مجھے جیون کی پھٹپھٹی یاد آئی۔ میرے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ چابی اسی کی ہے۔ پھٹپھٹی گیراج میں کھڑی تھی۔ میں نے جا کر چابی لگائی تو لگ گئی۔ یہ مجگیون کے خلاف ایک ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ انگریز ایس پی کو لکھا جانے والا گمنام خط جیون ہی کا لکھا تھا۔ درحقیقت دونوں باپ بیٹا مجھے ہر صورت حویلی سے نکالنا چاہتے تھے..... لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مجگیون کے پاس جا رہا تھا۔ مجھ پر بہت سنگین موڈ طاری تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آج مجگیون سے کچھ پوچھ کر رہوں گا یا اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔

اپنے منتخب راستے پر نہایت احتیاط سے چلتا ہوا مجگیون کے کمرے میں پہنچا تو وہاں کوئی پہلے سے موجود تھا۔ اندر موجود دونوں افراد میں جو گفتگو ہو رہی تھی وہ میرے لیے نہایت اہم اور دھماکہ خیز تھی۔ اس گفتگو کے بارے میں آپ کو آخر میں بتاؤں گا۔ بس یہ

سمجھ لیجئے کہ یہ گفتگو سن کر میرا شک یقین میں بدل گیا..... حویلی میں ہونے والی قتل کی وارداتوں میں ٹھاکر دلجیت اور اس کے بیٹے کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ جی ہاں اس معاملے میں وہ دونوں بے قصور تھے۔ مجرم کوئی اور تھا..... اور جو کوئی بھی تھا اس کتاب خانے میں موجود تھا۔ وہ پہلی واردات سے لے کر اب تک اس کتاب خانے میں موجود رہا تھا اور شاید برسوں سے اس کتاب خانے تھا..... اپنی زندگی کا اہم چیلنج میرے سامنے تھا۔

سیاہ بکری کی لاش اور چھت سے خون ٹپکنے والے واقعے کا حویلی میں زبردست ردِعمل ہوا۔ پنڈتوں نے کہا کہ حویلی میں راکھشش آتما نے اپنے پاؤں پوری طرح جما لیے ہیں اور اب یہاں رہنا سخت خطرناک ہے۔ جو چند نوکر حویلی میں تھے وہ اسی صبح' اپنی تنخواہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ٹھاکر کی بیوی نے بھی آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ اب کسی صورت یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ دوپہر تک ٹھاکر نے بھی اپنا بوریا بستر باندھ لیا۔ میرے بہت کہنے کے باوجود ان لوگوں نے حویلی چھوڑ دی اور قصبے کے وسط میں واقع ایک دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے۔ ظاہر تھا روپ وتی بھی ان کے ساتھ تھی۔ اب اپنے پولیس دستے کے ساتھ میں اس وسیع و عریض عمارت میں تنہا تھا۔ ٹھاکر دلجیت نے نچلی منزل پر حویلی کے تمام کمرے تالے لگا کر بند کر دیے تھے صرف ہمارے استعمال کے لیے مہمان خانے کے تین کمرے کھلے رہنے دیے گئے تھے۔

اس روز سہ پہر کے وقت میں روپ وتی سے ملنے ان کے نئے گھر پہنچا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ پوچھ گچھ کے لیے میں روپ وتی سے مل چکا تھا۔ لہٰذا ٹھاکر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے روپ وتی سے کچھ اہم سوال پوچھنے ہیں۔ وہ مجھے مکان کی بیٹھک میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد روپ وتی نمستے کہتی ہوئی اندر آ گئی۔ پریشان کن حالات نے اس کا پھول سا چہرا کملا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی رات پیش آنے والے واقعے کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی۔ میری طرح اس کے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ رات کے واقعات میں کوئی حقیقت ہے۔ وہ اسے سراسر ڈرامہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے

تایا دلجیت اور اس کے بیٹے کو قصور وار سمجھتی ہے۔ شاید اسے اس بات کی حیرانی بھی تھی کہ میں نے ابھی تک ان دونوں کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ روپ وتی نے کھلے الفاظ میں کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کا مافی الضمیر سمجھ رہا تھا۔ ایک عام شخص کی طرح اسے بھی شبہہ ہو رہا تھا کہ حویلی میں ہونے والی تمام پُراسرار وارداتوں کا ذمہ دار وہی شخص ہے جس نے کل رات کا ناٹک رچایا ہے۔

میں نے کہا۔ "مس روپ وتی! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں ذرا مختلف قسم کا انسپکٹر ہوں۔ میں مجرم پر ہاتھ ڈالنے میں کوئی جلدی نہیں کرتا۔ اس وقت میرے لیے بہت آسان ہے کہ ٹھاکر دلجیت اور جُگجیون کو پکڑ کر لے جاؤں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔"

روپ وتی کے دل کی بات زبان پر آگئی۔ "لیکن کیوں؟..... آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

میں نے کہا۔ "روپ وتی! بہت جلد سب کچھ آپ کے سامنے آجائے گا۔ فی الحال میں آپ سے ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں۔"

"جی کہئے۔ میں سن رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مس روپ وتی۔ مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ پھر بھی آپ کا خیر خواہ ہونے کے ناطے۔ میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

روپ وتی پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے آواز دھیمی کر کے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "دیکھئے! میں جانتا ہوں کہ آپ اجے کمار سے محبت کرتی ہیں لیکن آپ نے زمانے کے خوف سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ درحقیقت آپ خود کو فریب دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پورے حوصلے اور اعتماد سے سچائی کا سامنا کریں۔ اگر مرحومہ بہن کے شوہر سے شادی کی خواہش رکھنا کوئی معیوب بات ہوتی تو میں آپ کو ہرگز ہرگز یہ مشورہ نہ دیتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا راستہ انس،

ہمدردی اور غمخواری کا ہے اور آپ کی سوچ ایک سچی عورت کی سوچ ہے..... اپنے فیصلے پر پچھتائیے نہیں، فخر کیجئے۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہیے اور ہر مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے....."

روپ وتی جھکی پلکوں سے میری باتیں سن رہی تھی اس کے چہرے کی باحیا سرخی اقرار کر رہی تھی کہ میں درست کہہ رہا ہوں اور وہ میری بہت سی باتوں سے اتفاق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے پر ایک حیرانی بھی تھی.....شاید اپنا راز کھلنے کی حیرانی۔

اچانک وہ چونک گئی۔ اس کی ذہین اور معاملہ فہم آنکھوں پر ایک سوال تھا۔ پھر یہ سوال اس کے لبوں پر آگیا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ..... ایسے باتیں کر رہے ہیں جیسے کہیں جا رہے ہوں؟"

میں نے کہا۔ "فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں۔ اگر بن گیا تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

روپ وتی نے لرز کر کہا۔ "انسپکٹر صاحب! میں آپ کو کوئی خطرناک کام نہیں کرنے دوں گی..... پھر اس منحوس کمرے میں تو رات گزارنا نہیں چاہتے؟"

میں حیران ہوا کہ روپ وتی اپنی ذہانت سے کتنی جلدی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی ہے۔ میں نے فوراً خود پر نہایت سنجیدہ موڈ طاری کر لیا اور کہا۔ "نہیں روپ وتی، ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

اس دوران دلجیت کمار ایک ملازم کے ساتھ چائے لے کر اندر آگیا۔ میں نے شکر کیا کہ روپ وتی کی کھوجی نگاہوں سے نجات ملی ہے۔ دس پندرہ منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں حویلی واپس آگیا۔

اس وقت رات کے ٹھیک دس بجے تھے۔ جب میں نے اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیں اور ٹارچ، ریوالور اور کمبل لے کر دوسری منزل کا رخ کیا۔ چابی سے قفل کھولنے اور پنڈتوں کی دھاگے وغیرہ توڑنے کے بعد میں نے دروازہ کھولا اور ٹارچ کی روشنی میں زینے چڑھتا اوپر آگیا۔ آج راہداریوں کے گیس لیمپ بھی روشن نہیں تھے لہٰذا

تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ گملوں میں لگے ہوئے پودوں اور بیلوں کے زرد پتے خنک ہوا کے ساتھ ڈبی دار فرش پر پُراسرار وسوسوں کی طرح رینگتے پھرتے تھے۔ میں طویل راہداری سے ہو کر کتاب خانے کے دروازے پر پہنچا اور قفل کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پہلے شمعدان جلایا پھر گیس لیمپ روشن کیا اور ریوالور ہولسٹر سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ پرانی کتابوں کی بھیدوں بھری خوشبو دامن میں اَن گنت کہانیاں سمیٹے کمرے میں چکراتی پھرتی تھی۔ مشرقی کھڑکی کے دھندلے شیشوں پر ایک پیڑ کا سایہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا پھر میز پر آ گیا۔ سب کچھ پچھلی دفعہ کی طرح تھا میز سے ڈھائی فٹ کی بلندی پر دیوار میں نصب گیس لیمپ مدھم آواز کے ساتھ جل رہا تھا۔ میز پر ایک بہت پرانا قلمدان رکھا تھا۔ ایک ہاتھی کی شکل کا پیپر ویٹ تھا اور ایک موٹی سی کتاب۔ میں نے کتاب اٹھالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ بہت پرانی کتاب تھی اور اس کے موضوع سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرحوم ٹھاکر وشوانا تھ کو واقعی حکمت اور ویدوں کے علم سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کتاب میں بہت سی عام اور خاص بیماریوں کے قدیم علاج درج تھے۔ یہ کتاب کوئی ڈھائی سو برس پہلے اتر پردیش کے ایک مہان وید (طبیب) نے لکھی تھی۔ کتاب میں مختلف کہانیاں بھی تھیں۔ یہ کہانیاں دراصل وہ خطوط تھے جو وید کو اپنے مختلف مریضوں کی طرف سے ملتے تھے اور جن میں بیماری کی علامات' اسباب اور مریض کے اپنے حالات درج ہوتے تھے۔ کتاب کا آغاز ہی ایک نوجوان رانی کی کہانی سے ہوتا تھا جو اپنے راجہ کی چالیسویں رانی تھی اور اسے نیند میں چلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے خواب میں ایک ایسا مرد ملنے آتا تھا جس کے جسم سے گھوڑے کی بو آتی تھی..... معلوم نہیں کیا کیا جھوٹ سچ بھرا ہوا تھا اس کتاب میں۔

میز پر بیٹھے ہوئے مجھے کوئی ایک گھنٹہ گزرا تھا۔ جب اچانک..... پھر میرا سر چکرانے لگا اور سینہ دھڑکنے لگا۔ میں نے چند گہری سانسیں لیں لیکن اپنی جگہ سے اٹھا نہیں اور خود کو کتاب میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہا اسی حالت میں کوئی آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ دفعتاً مجھے ایسا لگا کہ کسی نے دونوں ہاتھوں سے گلا دبا دیا ہے اور سینے کے اندر

کوئی گھونسے مار رہا ہے..... اب یہ سب کچھ نہایت واضح اور قابلِ محسوس تھا۔ اگر یہ میرا وہم تھا تو پھر موت بھی وہم ہی رہی ہو گی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ کتاب خانہ مجھے اپنی نگاہوں میں گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ٹانگیں جیسے بے جان ہوئی جا رہی تھیں۔ میرے تصور میں سب انسپکٹر گابھا سنگھ کی لاش گھوم گئی۔ شاید وہ بھی اسی حالت کا شکار ہو کر دروازے کی طرف بھاگا تھا اور دروازہ کھولنے سے پہلے ہی گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ تو کیا..... میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔ یکایک مجھے بڑے زور کا چکر آیا۔ گیس لیمپ اور شمعدان کی مدھم روشنیاں گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ شاید میں بے ہوش ہونے والا تھا۔ پوری قوتِ ارادی جمع کر کے میں نے ہاتھ میز پر رکھے ریوالور کی طرف بڑھایا اور سر میز پر ٹکا کر دو فائر چھت کی طرف کر دیے۔ دوسرے دھماکے کی آواز میرے کانوں میں کہیں دور سے آئی تھی مجھے محسوس ہوا کہ ریوالور والا ہاتھ منوں وزنی ہو کر میز کی سطح سے ٹکرایا ہے۔ اس کے بعد کچھ ہوش نہ رہا۔

☆=======☆=======☆

دوبارہ ہوش آیا تو میں قصبے کے چوہدری شوبھا سنگھ کی حویلی میں تھا۔ دو ہندو سادھو' ایک مسلمان طبیب اور ایک وید میری چارپائی کے گرد جمع تھے۔ دلجیت کمار اور جیون بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہر چہرے پر خوف منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی ساتھ والے کمرے میں پنڈت حضرات بیٹھے زور زور سے منتر پڑھ رہے تھے۔ میرے سرہانے ایک مولوی صاحب خاموشی سے "پنج سورتے" کی تلاوت میں مصروف تھے۔ میری ناک کے نتھنوں میں روئی تھی' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میری نکسیر پھوٹتی رہی ہے۔ کچھ خون آلود روئی نیچے فرش پر بھی پڑی تھی قریب ہی ایک ٹوکری میں اوپلوں کی راکھ پڑی ہے' غالباً میں نیم بے ہوشی میں قے کر رہا تھا۔

میرے ہوش میں آتے ہی میرا سب انسپکٹر رام چند پاس آیا اور جھک کر بولا۔ "بھگوان کا کرم ہے آپ ہوش میں آ گئے۔ آٹھ پہر ہو گئے ہم سب کو دعائیں کرتے ہوئے۔"

یہ جان کر میں حیران ہوا کہ اس واقعے کو آٹھ پہر گزر چکے ہیں۔ میرے پوچھنے پر سب انسپکٹر نے بتایا کہ میری ہدایت کے مطابق وہ جاگ رہے تھے اس لیے رات بارہ بجے کے قریب جونہی دو فائر ہوئے وہ بھاگتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے کھلا تھا اور میں کرسی پر بے سُدھ پڑا تھا۔ مجھے وہاں سے اٹھا کر شوبھا سنگھ کی حویلی میں لایا گیا۔ ایک روز پہلے کی طوفانی بارش سے راستے خراب تھے۔ اس لیے شہر لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی میری حالت سفر کے قابل نہیں تھی۔ لہٰذا وہیں پر آٹھ پہر دیسی طریقے سے میرا علاج ہوتا رہا۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد مجھ پر غنودگی غالب آگئی۔ پھر میں اگلے روز دوپہر کے وقت اٹھا۔ کھڑکیوں میں چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ طبیعت اب قدرے بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روپ وتی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کے ساتھ دروازے کے پاس کھڑی ہے شاید مجھے دیکھنے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش شکوہ تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "دیکھا' وہی کیا نا جس سے روک رہی تھی کتنے ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے تمہیں' جس کی خاطر خواہ مخواہ زندگی داؤ پر لگا رہے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ واپس۔ اس حویلی کے اندھیرے کا رزق بننے سے پہلے چلے جاؤ۔"

اتنے میں اے ایس آئی رام چند چوہدری شوبھا سنگھ اور ایک نئے کانسٹیبل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نئے کانسٹیبل نے ایک رقعہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ یہ ڈی ایس پی صاحب کی طرف سے تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"انسپکٹر خاں! ابھی نیل پور سے ایک حوالدار پہنچا ہے جس کی زبانی پتہ چلا ہے کہ سخت بیمار ہو سخت تشویش ہوئی اب تک ٹھاکر واشوناتھ کی حویلی کے بارے جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کچھ ایسی گڑبڑ ہے جس سے نبٹنا پولیس کے بس میں نہیں۔ بعض پرانی عمارتوں اور بند جگہوں میں ایسی گیسیں وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں جو انسان کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں' ہو سکتا ہے یہاں بھی کوئی ایسا ہی چکر ہو۔ لوگ تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ تم فوراً واپس چلے آؤ۔ ہم

خواہ مخواہ اپنے عملے کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ایک بار پھر ہدایت کرتا ہوں کہ اب کسی قسم کی مہم جوئی کی ضرورت نہیں۔ اگر حالت سفر کے قابل ہے تو خط ملتے ہی روانہ ہو جاؤ۔ ایک ڈاکٹر ساتھ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے وہ تمہیں اچھی طرح دیکھ لے گا۔"

میں نے خط مکمل کیا تو چوہدری شوبھا سنگھ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ مخصوص لہجے میں بولا۔

"نواز صاحب! بس کرو۔ چھوڑ دو اس چکر کو بہت لاشیں دیکھ لی ہیں ہم نے اب تو ٹھاکر صاحب نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اس حویلی کو گرا کر یہاں ایک مندر بنوا دیں گے۔ بس اب آپ جانے دیں اس قصے کو۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو مندر کی زیادہ خواہش ہے یا حویلی سے چھٹکارا پانے کی؟"

وہ بولا۔ "ہماری تو ایک ہی خواہش ہے نواز صاحب! اب کوئی اور ڈر گھٹنا نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں! اب کوئی ڈر گھٹنا نہیں ہو گی۔"

☆=======☆=======☆

رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں چوہدری کی حویلی میں بستر پر لیٹا تھا لیکن خیالوں میں ٹھاکروں کی حویلی بسی ہوئی تھی۔ ذہن بار بار ایک ہی دائرے میں گھوم رہا ہے۔ دل کہتا تھا کہ جو گڑبڑ بھی ہے کتاب خانے کی اس میز کے اردگرد ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کتاب خانے میں رات گزاری تھی' لیکن جیسے ہی میز کے پاس گیا تھا' طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ شاید میز کے بند درازوں میں کوئی چیز تھی یا ہو سکتا ہے سر کے قریب جلنے والے گیس لیمپ سے خارج ہونے والی گیس اثر کرتی ہو' یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب کا کوئی عمل دخل ہو۔ یہ حقیقت تھی کہ تینوں اموات کے وقت ایک ہی کتاب میز پر موجود تھی اور میری طبیعت بھی دونوں دفعہ وہی کتاب پڑھتے ہوئے بگڑی تھی۔ اچانک مجھے وہ کہانی یاد آئی جو کتاب کے شروع میں تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تنہائی میں وہ پُراسرار کہانی پڑھنے

سے آدمی کا گلا نہیں رکتا اور ناک منہ سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ یقیناً کسی تیز اثر زہر کی کارستانی ہے۔ وہی زہر جس نے سب انسپکٹر گابھا سنگھ کے معدے میں گھس کر اس کا خون اتنا گاڑھا کر دیا کہ حرکتِ قلب بند ہو گئی۔

بہرحال کچھ بھی تھا میرے اندر کا شخص مجھے ایک بار پھر اُس حویلی میں جانے پر اُکسا رہا تھا۔ دل سے بار بار آواز آتی تھی۔ "انسپکٹر نواز! اگر تم یہ کام ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تو اس کا مطلب ہو گا تم میں اور اُن پنڈتوں میں کوئی خاص فرق نہیں جو ان تمام واقعات کو شیطانی آتما کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ اگر تم نے کتاب خانے کی اُلجھن کو سلجھا لیا تو یہ تمہارے یقین کی فتح ہو گی' ورنہ پنڈتوں کے وشواش کو سچ مانا جائے گا.....!"

آخر میں نے ایک بار پھر ہمت باندھی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہر سے آنے والا ڈاکٹر قریب ہی ایک آرام کرسی پر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں گرم چادر لپیٹ کر دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ برآمدے میں ایک کانسٹیبل کے خراٹے گونج رہے تھے۔ اُس کے قریب سے گزر کر میں صحن میں پہنچا اور پھر ایک راستے سے چار دیواری پار کر گیا۔

کوئی دس منٹ بعد میں ٹھاکروں کی حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ نچلی منزل پر میرے عملے کے دس مسلح افراد کے سوا اب یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے بیماری کی حالت میں اپنے درمیان دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ میں نے ایس آئی رام چند سے کہا۔

"رام چند! میرا پستول اور ٹارچ لاؤ۔ میں کتاب خانے میں جانا چاہتا ہوں۔"

رام چند کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ "کیا کہہ رہے ہیں جناب' آپ کی حالت ٹھیک نہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "رام چند' میری ذہنی یا جسمانی حالت پر شبہہ نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور تمہیں مجھے ہدایات دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں اپنا اچھا بُرا سمجھتا ہوں۔"

رام چند بولا کچھ نہیں لیکن میرے فیصلے سے وہ خوفزدہ تھا۔ دو روز پہلے کی طرح میں نے اُسے ہدایت کی کہ میرے جانے کے بعد وہ چوکس رہے اور اگر فائر کی آواز آئے تو ساتھیوں کے ہمراہ فوراً اوپر چلا آئے۔ اُس نے تابعداری میں اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے

ٹارچ اور ریوالور سنبھالا۔

کتاب خانے اور زینوں کی چابیاں لیں اور نکل کھڑا ہوا۔ کافی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹانگیں بے جان سی محسوس ہونے لگیں۔ دوسری منزل اُسی طرح گھمبیر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں محتاط قدموں سے کتاب خانے تک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کتاب خانے کا پُراسرار ماحول اپنی تمام وحشت کے ساتھ ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ شمعدان اور لیمپ جلانے کے بعد میں کچھ دیر چارپائی پر لیٹ کر سانسیں درست کرتا رہا..... پھر ایک عزم کے ساتھ اُٹھا اور اس خطرناک میز پر آ بیٹھا۔ آج میرا پورا دھیان اپنے آپ کی طرف تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ طبیعت کس وقت خراب ہونا شروع ہوتی ہے..... قریباً پندرہ منٹ میں بغیر حس وحرکت کُرسی پر بیٹھا رہا۔ گیس لیمپ سے ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی لیکن مسالے کی مخصوص خوشبو کے علاوہ اور کوئی خوشبو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیمپ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے "طب" کی وہ موٹی کتاب اُٹھائی۔ اُسے اُلٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ پھر اُسے ناک کے قریب کر کے سونگھا۔ پرانے کاغذوں کی باس کے سوا کوئی خوشبو نہیں تھی۔ تب میں نے ایک ایک کر کے تمام دراز کھولے اور اچھی طرح دیکھ ڈالے۔ چند موم بتیوں ماچسوں اور مُردہ ٹڈیوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔

اس کے بعد میں کوئی دو گھنٹے سکون سے بیٹھا رہا اور ہر لمحہ اپنی اندرونی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میرے دل میں ایک عجیب سا خوف جاگزیں ہونے لگا۔ تھکے ماندے ذہن میں یہ وسوسہ سر اُٹھانے لگا کہ ہو نہ ہو یہ اُس پُراسرار کہانی کا کرشمہ ہے جسے پڑھتے ہوئے دو دفعہ میری طبیعت بگڑی ہے۔ بظاہر انہونا سا خیال تھا لیکن اُس ماحول میں بڑی شدت کے ساتھ میرے ذہن پر غالب آنے لگا۔ اس خیال کی تصدیق کے لئے میں نے مضبوط ارادے سے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اُسے کھول کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے وہی' "چالیسویں رانی کی کہانی" تھی۔ پرسوں میں نے سولہ صفحے تک پڑھا تھا۔ اب آگے پڑھنا شروع کیا۔ عجب دقیانوسی واقعات تھے۔ نہ کوئی سر نہ پیر۔ بہرحال ایک طرح کا اسرار اُن

میں موجود تھا۔ بے شمار لفظ سنسکرت کے تھے۔ میں دھیرے دھیرے سوچ سمجھ کر پڑھتا رہا۔ قریباً سات آٹھ صفحے میں نے اور پڑھے تھے کہ اچانک طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ یوں لگا کہ گلے کے راستے کوئی تیزابی مادہ جسم میں اُترتا جارہا ہے اور اُس کے اثر سے سانس گھٹنے لگا ہے۔ منہ میں آہستہ آہستہ ایک عجیب سا ذائقہ گھلتا جارہا تھا..... "یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟" میں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر سوچا' کیا راز ہے اس کتاب میں؟ دل میں آئی کہ یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر واپس نیچے چلا جاؤں' لیکن چند منٹ بعد میں نے پھر حوصلہ جمع کیا اور آگے پڑھنے لگا..... رانی مایادیوی کا محبوب ہر رات آتا تھا' لیکن خاموش رہتا تھا۔ ایک رات وہ آیا تو رانی دھرم شاستر پڑھ رہی تھی۔ شاستر دیکھتے ہی وہ واپس مڑا اور گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوا واپس بھاگ گیا۔ رانی اُس کی آواز سن کر سکتے میں رہ گئی..... اس طرح کی فضول اور بے معنی باتیں پوری کہانی میں بھری ہوئی تھیں..... میں نے چار پانچ صفحے اور پڑھے اور طبیعت بتدریج بگڑتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ کسی بھی وقت دل کی حرکت بند ہوجائے گی۔ جسم کے ایک ایک مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ منہ کا ذائقہ سخت کڑوا ہوگیا تھا۔ کہانی کا آخری صفحہ اُلٹنے کے لئے جونہی میں نے منہ کی طرف ہاتھ بڑھایا' اچانک ٹھٹک کر رُک گیا۔ ایک ہی لمحے میں چاروں طرف جیسے برق لہرا گئی اور وہ گتھی سلجھ گئی جس نے کئی ماہ سے ایک خلقت کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہر تاریک گوشہ روشن ہوگیا۔ اب میں پورے یقین کے ساتھ بتاسکتا تھا کہ کتاب خانے میں ہونے والی تین اموات زہر خوردنی سے ہوئی ہیں اور یہ بھی بتاسکتا تھا کہ وہ زہر انہیں کیسے دیا گیا ہے۔ جو ہاتھ میں نے صفحہ اُلٹنے کے لئے اُٹھایا تھا وہ ابھی تک اٹھا ہوا تھا۔ اُس کا رخ کتاب کی طرف نہیں بلکہ میرے منہ کی طرف تھا۔ صفحہ اُلٹنے سے پہلے حسبِ عادت میں انگلی کو تھوک سے گیلا کرنا چاہتا تھا اور یہی وہ عمل تھا جو مجھ سے پہلے تینوں افراد نے کیا تھا..... اور جو بھی اس کتاب کو پڑھتا اُس نے یقیناً یہی عمل کرنا تھا۔

صفحہ اُلٹتے ہوئے انگلی کو تھوک لگانا ایک ایسا فعل ہے جس کی طرف ہم بالکل توجہ نہیں دیتے' لیکن یہ فعل اس کتاب خانے میں "موت کا فعل" بن گیا تھا۔ وہی اُنگلی جو

کتاب کے صفحوں سے چھوتی تھی' بعد میں زبان سے لگتی تھی اور کتاب کے صفحوں پر کوئی خطرناک کیمیکل موجود تھا..... میں جلدی سے اُٹھا۔ پانی تو موجود نہیں تھا' رومال سے خوب رگڑ رگڑ کر زبان کو صاف کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ کرسی پر آبیٹھا۔ کتاب کو گیس لیمپ کی طرف کرکے نہایت غور سے اُس کے صفحات دیکھے پھر ایک دوسری کتاب کے صفحوں سے اُس کا موازنہ کیا جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ منحوس کتاب کے صفحوں پر کسی شے کی غیر محسوس تہہ موجود ہے اور عام کاغذ سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس انکشاف سے مجھ پر جو خوشی طاری ہوئی بیان سے باہر ہے۔ لمحوں میں ساری بیماری بھول گئی اور میں پوری طرح ہشاش بشاش ہوگیا۔

☆========☆========☆

یہ ڈھائی سو سال پرانی کتاب کسی ہندو وید نے لکھی تھی۔ یہ "شاہکار" کتاب لکھنے کے بعد اُس کمبخت نے اپنی حکمت کا ایک اور جوہر دکھایا تھا۔ اُس نے کتاب کو محفوظ کرنے کے لئے اُس کے صفحوں پر کسی نامعلوم کیمیائی مرکب کا استر چڑھادیا تھا۔ غالباً کتاب کو دھونی دی گئی تھی۔ اس مرکب میں "ست کچلا" جیسے خطرناک اجزاء موجود تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مرکب مزید زہریلا ہوگیا تھا۔ وید تو مرگیا لیکن اس کتاب کو آنے والوں کے لئے موت کا پھندا بناگیا۔ نہ جانے یہ منحوس کتاب کب سے ٹھاکر وشواناتھ کے کتاب خانے میں موجود تھی۔ وشواناتھ کو بھی "حکمت" کا شوق تھا۔ آخر ایک روز "کتاب" اور "وشواناتھ" کا آمنا سامنا ہوگیا اور نتیجہ وشواناتھ کی پُراسرار موت کی صورت میں نکلا۔ بدنصیبی یہ ہوئی کہ اس کتاب کو دوبارہ شیلف میں نہیں رکھا گیا اور وہ اجل کا پھندا بن کر وشواناتھ کی میز ہی پر پڑی رہی..... چند ہفتے بعد وشواناتھ کی ملازمہ صفائی کرتی ہوئی آئی۔ وہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی۔ کتاب اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی لیکن اُس پر زہر کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ دم گھٹنے پر وہ چیختی چلاتی بھاگی اور سیڑھیوں سے نیچے گر گئی۔ کتاب کا اگلا شکار بدنصیب نرگس تھی۔ وہ شاید پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے باپ کے کتاب خانے میں کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ میز پر کتاب پڑی دیکھ کر اُس نے

ورق گردانی شروع کردی۔

کہانی جنسی اور کسی حد تک دلچسپ تھی۔ وہ پڑھتی چلی گئی اور صفحوں پر موجود زہر دھیرے دھیرے اُس کے جسم میں اُترتا گیا۔ وہ چونکہ کھانا کھا کر آئی تھی۔ اس لئے زہر نے فوراً اثر نہیں کیا اور جب خاصی مقدار اندر پہنچ گئی تو یکبارگی اُس کا اثر شروع ہوا۔ نرگس لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ گھبراہٹ میں اُس کی ساڑھی پاؤں کے نیچے آکر کھل گئی۔ گرتے ہوئے اس کے جسم پر کچھ خراشیں بھی آئیں۔ جس کی وجہ سے یہ سمجھا گیا کہ شاید اُس پر مجرمانہ حملہ ہوا..... اس موت کے بعد بھی کتاب وہیں میز پر پڑی رہی اور اپنے اگلے شکار کی منتظر رہی۔ اگلا شکار میرا سب انسپکٹر گابھا سنگھ تھا۔ اُس نے شیخی میں آکر رات کتاب خانے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ رات سونے سے پہلے اُس نے کتاب کی ورق گردانی شروع کردی۔ رنگین مزاج تو وہ تھا ہی اور ویسے بھی اُس کی شادی ہو رہی تھی۔ بیچارے نے سوچا ہوگا کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اپنے طور پر وہ کتاب پڑھتا رہا لیکن درحقیقت انتہائی مہلک زہر اُنگلی سے چاٹتا رہا اور آخر حسرتناک موت سے دوچار ہوا۔

اب میں آپ کو اُس گفتگو کے بارے میں بتاتا ہوں جو میں نے جُگجیون کے کمرے سے سنی تھی اور جسے سننے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا کہ کتاب خانے کی تینوں اموات میں دلجیت اور جُگجیون کا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ گفتگو درحقیقت دلجیت اور جُگجیون کے درمیان ہی ہوئی تھی۔ دلجیت بیٹے کو ڈانٹ رہا تھا کہ اُس نے میرے ساتھ ڈرامہ کھیل کر غلطی کی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تُو انسپکٹر کو اُلو کا پٹھا سمجھتا ہے لیکن حقیقت میں تُو خود ہے۔ میں تیری بیوقوفیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ پہلے تُو نے روپ وتی کو منگنی کے کارڈ دکھا کر مسئلہ کھڑا کیا اب بکریاں ذبح کرکے انسپکٹر کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تیری طرح کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ میں تو حیران ہوں' ایسا ڈراؤنا کھیل کھیلتے ہوئے تجھے بھگوان کا خوف بھی نہیں آیا۔ اگر حویلی میں واقعی کوئی بُری آتما بھٹک رہی ہے تو کل بکری کی طرح تیری لاش بھی کسی کمرے میں پائی جاسکتی ہے۔ کچھ بھگوان کا خوف کر..... میں

تو سوچ رہا ہوں کہ معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑے تو حویلی گرا کر یہاں مندر بنوادوں۔ کچھ تو ہمارے پاپوں کا پرائسچت ہو۔ (گناہوں کا کفارہ)

یہ باتیں مجھے سمجھانے کے لئے کافی تھیں کہ دلجیت اور اُس کا بیٹا لالچی اور خودغرض ہونے کے باوجود قاتل نہیں۔ انہوں نے صرف صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور جیون نے اپنی بیوقوفی سے خواہ مخواہ تفتیش کا رُخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ بہرحال میں باپ بیٹے کو اُن کے کئے کی سزا دلانا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ دونوں اپنی عیاری سے ایک تنہا لڑکی کو اُس کے ورثے سے محروم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اُس کی مرضی کے خلاف اُسے شادی پر مجبور کر رہے تھے۔ اُن پر دھوکہ دہی' غبن اور حبس بے جا کے کیس بنتے تھے..... اور میں نے یہ کیس بنا کر انہیں قرار واقعی سزا دلوائی۔ اس سلسلے میں مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔ اگر میں روپ وتی کا ساتھ نہ دیتا تو وہ کبھی دلجیت کمار اور جُگجیون کو مجرم ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہوتی..... عدالت میں پیش کرنے سے پہلے "قاتل کتاب" کا کیمیائی تجزیہ ہوا۔ میرے خیالات کی حرف بہ حرف تصدیق ہوئی۔

مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ اس نیم حکیم کے مزید شاہکار بھی کتاب خانے میں موجود نہ ہوں۔ میں نے پورے کتاب خانے کی چیکنگ کراکے تسلی کی..... طویل عدالتی کارروائی کے دوران' روپ وتی اور اجے کی ملاقات بار بار ہوتی رہی۔ اسی میل ملاپ کے دوران اُن کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ اس نئے رشتے کو استوار کرنے میں روپ وتی نے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ وہ اجے کے دُکھوں اور محرومیوں کو سمجھتی تھی۔ اپنی دیدی کی پرچھائیں بن کر وہ اجے کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی..... ٹھیک ایک سال بعد وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اجے کی خودداری قائم تھی اور وہ روپ وتی کی دولت پر عیش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر حالات اب بدل چکے تھے۔ اُس کے لئے لازمی تھا کہ وہ روپ وتی کا سہارا بن کر حویلی میں رہے اور دونوں مل کر جائیداد کی دیکھ بھال کریں۔

..... میں نے شادی کے روز حویلی کو دیکھا۔ وہی..... در و دیوار جن پر خوف کے سانپ رینگا کرتے تھے آج بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ ایک ایک گوشے سے قمقموں کے جلترنگ پھوٹ رہے تھے۔ ہر طرف رنگ برنگ آنچلوں کی بہار تھی۔ کہاں تھی اُداسی کہاں تھی ویرانی اور تاریکی؟ کہاں تھے شیطانی آتماؤں کے سائے؟ کہیں نہیں تھے..... کہیں بھی نہیں تھے۔ انسان کا یقین انسان کے وہم پر فتح پا چکا تھا۔

☆========☆========☆